(مضامینِ علمیہ)

قسط : ۱

جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار و نظریات

ایک مختصر جائزہ

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد زید مجدہم
مدرّس و نائب مفتی و فاضل جامعہ مدنیہ

ایک صاحب جاوید احمد غامدی نام کے لاہور میں ایک عرصہ سے دین کے نام پر کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے بظاہر کہیں سے باقاعدہ دینی تعلیم حاصل نہیں کی۔ اسلاف کے علم پر مطمئن نہیں۔ لہٰذا دین کے علمی میدان میں اپنی انفرادیت کے قائل ہیں۔ اگرچہ اس کے لیے ان کو جہل مرکّب کے ستون پر ہی کھڑا ہونا پڑے۔ المورد کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کر رکھا ہے اور پہلے المورد اور اب اشراق کے نام سے ماہنامہ نکالتے ہیں۔

اپنی کتاب میزان حصّہ اوّل میں جاوید غامدی صاحب نے "قانون میراث" کے نام سے اپنا ایک مضمون شائع کیا ہے۔ ہم نے جاوید غامدی صاحب کے بارے میں جو بات اُوپر کہی یہ مضمون اس کا مظہر اعلیٰ اور مصداق عظیم ہے۔ اس مضمون پر ہمارا ایک ناقدانہ تبصرہ مجلّہ منہاج میں چند سال پہلے شائع ہوا تھا۔ وہ اب مزید توضیح کے ساتھ انوارِ مدینہ کے قارئین کی خدمت میں پیش ہے، لیکن اس سے پیشتر جاوید غامدی صاحب کا مزید تعارف حاصل کرنے کے لیے اختصار کے ساتھ ان کے چند تفردات پیش کیے جاتے ہیں۔

بسم اللہ نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

۱۔ امین احسن اصلاحی کے تفسیر و حدیث سے متعلق اُصول سے اتّفاق

ماہنامہ اشراق جون ۱۹۹۳ء کے صفحہ ۴۳ پر غامدی صاحب لکھتے ہیں۔

"فکر فراہی و اصلاحی میرے نزدیک . . . . ان اُصولوں کا نام ہے جو فراہی و اصلاحی

نے قرآن و سُنّت میں تفقہ اور ان سے اخذ و استنباط کے لیے اختیار کیے ہیں۔ ان اُصولوں کو میں بالکل صحیح سمجھتا ہوں اور اپنی ہر تحقیق میں ہمیشہ انہیں پیشِ نظر رکھتا ہوں۔"

امین احسن اصلاحی صاحب جن کو غامدی صاحب استاذ امام کہتے بھی نہیں تھکتے اُنھوں نے قرآن و سُنّت میں تفقہ سے متعلق دو کتابیں تصنیف کی ہیں ایک مبادی تدبّرِ قرآن اور دوسری مبادی تدبّرِ حدیث۔ ان دونوں کتابوں میں درج ذیل اُصول خود قرآن و حدیث اور عقل کے کتنے خلاف ہیں۔ اس پر ہم نے "تحفہ اصلاحی" کے نام سے ایک تبصرہ لکھا ہے جو کتابی صُورت میں تو اگرچہ ابھی تک نہیں چھپا، البتّہ جامعہ مدنیہ کے رسالہ انوار مدینہ میں قسط وار شائع ہو چکا ہے۔ اصلاحی صاحب کے اُصول کے بارے میں انتہائی مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے۔

ہُوئے تم دوست جس کے دُشمن اسکا آسماں کیوں ہو

۲۔ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی حیات اور نزول کا انکار

ماہنامہ اشراق اپریل ۱۹۹۵ء صفحہ ۴۵ پر لکھتے ہیں۔

"سیّدنا مسیح علیہ السّلام کے بارے میں جو کچھ میں قرآن مجید سے سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ اُن کی رُوح قبض کی گئی اور اس کے فوراً بعد اُن کا جسد مُبارک اُٹھا لیا گیا تھا کہ یہود اس کی بے حرمتی نہ کریں۔ یہ میرے نزدیک اُن کے منصب رسالت کا ناگزیر تقاضا تھا، چنانچہ قرآن مجید نے اسے اسی طرح بیان کیا ہے انی متوفیك ورافعك الی۔ اس میں دیکھ لیجیے توفی وفات کے لیے اور "رفع" اس کے بعد رفع جسم کے لیے بالکل صریح ہے۔"

اشراق جولائی ۱۹۹۴ء صفحہ ۳۲ پر لکھتے ہیں۔

"حضرت مسیح کو یہود نے صلیب پر چڑھانے کا فیصلہ کر لیا تو فرشتوں نے ان کی رُوح ہی قبض نہیں کی اُن کا جسم بھی اُٹھا کر لے گئے کہ مبادا یہ سر پھری قوم اس کی توہین کرے۔"

تبصرہ: حضرت عیسٰی علیہ السّلام کا زندہ آسمان پر اُٹھا لیا جانا اور قُربِ قیامت میں دوبارہ نازل ہونا اُمّت کے اجماعی عقیدوں میں سے ہے اور نزول مسیح علیہ السّلام کا مضمون تواتر سے ثابت ہے۔

غامدی صاحب نبی اور رسول کے درمیان فرق بیان کرتے ہیں۔ (دیکھیے میزان حصہ اوّل: اشراق جولائی ۱۹۹۴ء)

اس کا حاصل یہ ہے کہ باقی جتنے رسول ہیں اللہ تعالیٰ ان کی جان کے دشمنوں سے اُن کی حفاظت فرماتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے لیے آگ کو گلزار بنا دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے لیے سمندر کو پھاڑ دیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس طرح بچایا کہ قریش کے بڑے بڑے خاندانوں کے تیغ بند جوان آپ کے گھر کا محاصرہ کر کے کھڑے ہو گئے تو آپ ان کے سر پر خاک ڈال کر اس طرح نکل گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سُنّت بدل دی۔ یہود اُن کی جان کے دشمن تھے۔ غامدی صاحب کے بقول اللہ تعالیٰ نے خود ہی ان کی جان نکال دی اور محض اس اندیشے سے کہ کہیں یہود لاش کی بے حرمتی نہ کریں فرشتوں سے لاش اُٹھوا کر نہ جانے کہاں پہنچا دی۔ اسی طرح سہی یہود کی راہ سے مخالف تو نکل گیا۔ دشمن کو اپنا مقصود و مطلوب تو حاصل ہو گیا۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔

اور یہ کہنا کہ توفی وفات کے لیے بالکل صریح ہے۔ حقیقتاً علم سے محرومی کی دلیل ہے۔ سورۂ زمر آیت نمبر ۴۲ کا مطالعہ کریں۔

اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضی علیھا الموت و یرسل الاخری

اس آیت میں توفی کا لفظ ان لوگوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جن کی موت ابھی نہ آئی ہو۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ایک پہلو کے بیان کو فضول قرار دینا

اشراق ستمبر ۱۹۹۳ء صفحہ ۴ پر غامدی صاحب یوں لکھتے ہیں۔

"اس طرح جن لوگوں نے اس کی قدرت کا اقرار کیا، لیکن اس کی حکمت ان کی نگاہ میں نہ رہی اُنھیں ایمانیات کی فہرست میں اس طرح کی فضول باتیں بھی داخل کرنا پڑیں کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہیں تو اپنے سب سے زیادہ وفادار بندوں کو جہنّم میں ڈال دیں اور چاہیں تو نمرود و فرعون اور ابولہب جیسے حق کے دشمنوں کو جنّت میں سب سے پہلے اعلیٰ مقام

عطا فرمادیں۔"

تبصرہ : اللہ تعالیٰ تمام ممکنات (POSSIBILITIES) پر قدرت رکھتے ہیں۔ اس کی تفصیل میں اگر اہلِ حق نے مذکورہ بالا بات ذکر کردی تو غامدی صاحب اس کو فضول باتوں سے تعبیر کر رہے ہیں حالانکہ ان باتوں کا ذکر خود قرآن پاک میں ہے۔

قرآن پاک میں ایک جگہ فرمایا ان اللہ لا یغفر ان یشرك به (اللہ اسکو معاف نہیں فرمائیں گے کہ ان کے ساتھ شرک کیا جائے۔)

اس ضابطہ کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السّلام عرض کریں گے۔

ان تعذبھم فانھم عبادك وان تغفر لھم فانك انت العزیز الحکیم (سورہ مائدہ: ۱۱۸)

اگر آپ اُن کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور آپ ان کو معاف فرمادیں تو آپ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام عرض کر رہے ہیں کہ اگر آپ اپنے ضابطہ اور وعید کے مطابق اُن کو سزا دیں تو جب بھی آپ مختار اور قدرت والے ہیں اور اگر ضابطہ اور وعید کے برخلاف آپ بالفرض ان کو معاف فرمادیں تو جب بھی آپ مختار ہیں کیونکہ آپ زبردست قدرت والے ہیں جس میں معافی بھی شامل ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اللہ تعالیٰ کی عموم قدرت کے تحت وہی بات تو ذکر کر رہے ہیں جس کو غامدی صاحب فضول بات بتا رہے ہیں۔

۴۔ فقہاء پر طعنہ زنی

قانونِ میراث کے عنوان سے غامدی صاحب نے اپنی کتاب میزان حصّہ اوّل میں ایک مضمون شامل کیا ہے۔ اس پر ہمارا مفصّل تبصرہ آگے آرہا ہے۔ البتہ اس کے چند فقرے تو پڑھیے۔

"فقیہان کرام اس بات پر متفق ہیں کہ لڑکیوں کے حصّے بہرصورت پورے ترکے میں سے دیے جائیں گے ان حضرات کی یہی غلطی ہے جس کی وجہ سے اُنہیں 'عول' کا وہ عجیب وغریب قاعدہ ایجاد کرنا پڑا ہے۔ جس کو ماہرین فقہ وقانون کی بوالعجبیوں میں قیامت تک بلند ترین مقام حاصل رہے گا کسی شخص نے کبھی علمی دُنیا کے اعجوبوں کی تاریخ مرتّب کرنا شروع کی تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے علم میراث کی یہ یادگار اس میں سرفہرست ہوگی۔

یہ حضرات چونکہ لڑکیوں کو ہر حال میں پورے ترکے کا دو تہائی دلوانا چاہتے ہیں اس لیے بعض صورتوں میں ترکہ کسی طرح تقسیم نہیں ہوتا۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے ہمارے یہ فقہاء حصّوں میں ایک جیسی کمی کر دیتے ہیں۔ اسی کا نام علم میراث کی اصطلاح میں 'عول' ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اسلوب بیان کی نزاکتوں کو سمجھنے اور آیات پر غور و تدبّر کرنے کے بجائے ان حضرات نے یہ چیستان اللہ تعالیٰ سے منسوب کر دیا ہے اور اس کی دریافت کا سہرا حضرت عمرؓ کے سر باندھا ہے اس پر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائے۔" (ص ۵۰)

خود غامدی صاحب کے بقول تمام فقہاء عول کے مسئلہ پر متفق ہیں، لیکن اسلوب بیان کی نزاکتوں کا جو ادراک غامدی صاحب کو چودہ صدیوں بعد حاصل ہوا ہے۔ تمام فقہاء اس سے محروم ہی رہے۔ اور یہ غامدی صاحب کی بڑی فیاضی ہے کہ اُن کی اتنی بڑی کوتاہی کے باوجود غامدی صاحب ان کے لیے معافی کی دُعا کر رہے ہیں۔

غامدی صاحب نے اپنے اس مقالہ میں اپنے غور و تدبّر کے جو کارنامے دکھائے ہیں ان کو ہمارے تبصرے میں ملاحظہ فرمائیے گا۔

۵۔ مرتد کی سزائے موت کا انکار

اُمّت مسلمہ کے ایک اور متفق علیہ مسئلہ یعنی مرتد کی سزائے موت سے غامدی صاحب متفق نہیں۔ ان کے مطابق چودہ سو سال تک اس مسئلہ کے بارے میں اُمّت گمراہی میں مُبتلا رہی اور اَب چودہ صدیوں کے بعد غامدی صاحب عربی ادب و بلاغت اور اسلوب بیان کی نزاکتوں کے کمال ادراک سے متصف ہو کر اُمّت کو اس گمراہی سے نکالنے آئے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"ارتداد کی سزا کا یہ مسئلہ محض ایک حدیث کا مدعا نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ابن عبّاس کی روایت سے یہ حدیث بخاری میں اس طرح نقل ہوئی ہے۔

من بدل دینہ فاقتلوہ جو شخص اپنا دین تبدیل کر لے اسے قتل کر دو۔

ہمارے فقہا اسے بالعموم ایک حکم عام قرار دیتے ہیں جس کا اطلاق ان کے نزدیک ان سب لوگوں پر ہوتا ہے جو زمانہ رسالت سے لے کر قیامت تک اس زمین پر کہیں بھی اسلام کو چھوڑ کر کفر

اختیار کریں گے۔ اُن کی رائے کے مطابق ہر وہ مسلمان جو اپنی آزادانہ مرضی سے کُفر اختیار کرے گا۔ اسے اس حدیث کی رو سے لازماً قتل کر دیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اُن کے درمیان اگر کوئی اختلاف ہے تو بس یہ کہ قتل سے پہلے اُسے توبہ کی مہلت دی جائے گی یا نہیں اور اگر دی جائے گی تو اس کی مُدّت کیا ہونی چاہیے۔ فقہائے احناف البتّہ عورت کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ہر مرتد کی سزا خواہ وہ عورت ہو یا مرد اسلامی شریعت میں بہرحال قتل ہی ہے۔

لیکن فقہاء کی یہ رائے کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ حکم تو بیشک ثابت ہے مگر ہمارے نزدیک یہ کوئی حکم عام نہ تھا بلکہ صرف انہی لوگوں کے ساتھ خاص تھا۔ جن میں آپ کی بعثت ہوئی اور جن کے لیے قرآن مجید میں امیین یا مُشرکین کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔"

(اشراق دسمبر ۱۹۹۴ء صفحہ ۴۲)

۶۔ احسان و تصوف کو گمراہی قرار دینا

اشراق جولائی ۱۹۹۳ء صفحہ ۳۶ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

"اُس لحاظ سے دیکھا جائے تو اللہ کی ہدایت یعنی اسلام کے مقابلے میں تصوّف وہ عالمگیر ضلالت ہے جس نے دُنیا کے ذہین ترین لوگوں کو متأثّر کیا ہے۔"

تبصرہ: غامدی صاحب عربی اشعار کی کچھ واقفیت اور اسلوبِ بیان کی نزاکتوں کے اختراع کو اپنی پونجی بنا کر عالمگیر منصف بن گئے ہیں اور اب اُن کے قلم نے یہ فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ امام غزالی، حضرت مجدّد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت سیّد احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید اور سلسلۂ تصوّف سے منسلک تمام ہی حضرات عالمگیر ضلالت و گمراہی میں مُبتلا تھے۔

بدعتی لوگ شاہ اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ پر تقویت الایمان جیسی توحید خالص پر عظیم الشّان کتاب کی وجہ سے کُفر کا اِلزام دیتے ہیں اور جاوید غامدی جیسے لوگ ان کو عبقات جیسی کمال توحید پر عالی شان کتاب کی وجہ سے ضلالت و گمراہی کا ملزم ٹھہراتے ہیں۔

جہل مرکّب میں مُبتلا لوگوں کا یہی معاملہ ہوتا ہے کہ جب کسی بڑے کی بات کو وہ جیسی سمجھنی

چاہیے۔ سمجھ نہیں پاتے تو غلط سلط جو سمجھا ہوتا ہے۔ اس کو اصل بنا کر فیصلہ جاری کرتے ہیں اور پھر کوئی صحیح مطلب سمجھائے تو اسی کو غلطی پر کہتے ہیں۔

غامدی صاحب نے حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ کی عبقات سے یہ عبارت بھی بطور اعتراض نقل کی ہے۔

اتفق اهل الكشف والوجدان وارباب الشهود والعرفان مؤيدين بالبراهين العقلية والاشارات النقلية على ان القيوم للكثرات الكونية واحد شخصى

اس کا ترجمہ وہ یوں کرتے ہیں۔

وہ سب لوگ جو کشف و وجدان اور شہود و عرفان کی نعمت سے بہرہ یاب ہوئے اس بات پر متفق ہیں کہ تمام مخلوقات کے لیے مابہ التعین ایک ہی متعین وجود ہے اور عقل کے دلائل اور قرآن و حدیث کے اشارات سے ان کی اس بات کی تائید ہوتی ہے

مابہ التعین کی وضاحت غامدی صاحب حاشیہ پر اس طرح کرتے ہیں یعنی جس سے کوئی چیز موجود ہوتی ہے جیسے لوہے سے تلوار اور چھری وغیرہ۔ (ص ۳۵ اشراق جولائی ۱۹۹۳ء)

غامدی صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عبقات کی عبارت کا مطلب یہ ہے جیسے لوہا مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے کبھی تلوار کی، کبھی چھری کی وغیرہ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا وجود مخلوقات کی صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ عبارت کا ترجمہ بھی بالکل غلط کیا اور مطلب بھی انتہائی غلط اور گندا سمجھا۔

عبارت کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔

تمام ارباب کشف و وجدان اور شاہد و عرفان والوں کا یہ اتفاقی فیصلہ ہے جس کی تائید میں وہ عقلی دلائل اور نقلی قرائن بھی پیش کرتے ہیں کہ کائنات کی ساری کثرتیں (بہ شکل جمادات و نباتات، حیوانات و انسان علویات و سفلیات وغیرہ جو نظر آ رہی ہیں) ان کا قیوم ایک واحد شخصی وجود ہے۔

غامدی صاحب کی غلطی کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے عبقات کی عبارت میں قیوم (جس کا ترجمہ غامدی صاحب نے مابہ التعین کیا ہے) سے خدا کا وجود سمجھ لیا ہے۔

حالانکہ شاہ اسمٰعیل شہید تو عبقات ہی میں اس قیوم اور واحد شخصی وجود کو امکانی وجود کہتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا وجود واجب ہے اور وہ اس قیوم اور امکانی وجود کا خالق ہے۔ اس بات کو شاہ صاحب ہی کی دی ہوئی مثال سے سمجھئے۔

ہم اپنے ذہن میں ایک درخت کا نقشہ بناتے ہیں اس کو ہم اپنی خیالی اور ذہنی تخلیق کہہ سکتے ہیں اب ایک شخص مثلاً زید اپنے ذہن میں ایک باغ کا نقشہ جماتا ہے اور اس کے خیال کی طرف پوری طرح منہمک ہو جاتا ہے۔ باغ میں درخت بھی ہیں پھول بھی ہیں۔ فوارے بھی ہیں۔ پرندے ہیں اور چلنے کے راستے بھی ہیں۔ غرض بہت سی چیزیں ہیں۔ ایک خیالی وجود ہے جو ان تمام خیالی اشیا میں مشترک ہے۔ اگر یہ وجود نہ ہو تو یہ اشیاء بھی موجود نہ ہو سکیں۔ تو ان تمام ذہنی تخلیقات کو ذہنی اور خیالی وجود قائم رکھے ہوئے ہے۔ لہٰذا یہ خیالی وجود ان خیالی اشیاء کا قیوم ہے، لیکن کیا ان اشیاء کا ذہنی وجود بعینہٖ زید کا وجود ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ بلکہ زید تو اس ذہنی وجود کا خالق ہے اور وہ خود اس کا قیوم ہے۔ یعنی وہ خیالی وجود کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

اسی طرح سمجھئے کہ عالم کی تمام چیزوں میں جو ہمیں وجود نظر آرہا ہے شاہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ امکانی وجود ہے اور تمام اشیاء کے لیے وہ قیوم ہے، لیکن خود اس امکانی وجود اور قیوم کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں اور جیسے زید اپنی خیالی مخلوقات سے متصف نہیں ہو جاتا اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنی مخلوقات اور اُن کے آثار سے متصف نہیں ہوتے۔[۵]

نمونہ اور مثال کے طور پر یہ چند باتیں ذکر کر دی ہیں۔ ان لوگوں کا مبلغ علم دیکھئے اور ان لوگوں کی جرأتیں دیکھیے۔ حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ——————

—————— یہ علم تو دین ہے اور تمہیں یہ دیکھنا لازم ہے کہ کس شخص سے اپنے دین کو حاصل کر رہے ہو۔[۱] یہ بڑی اہم اور بنیادی ہدایت ہے جس کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

---

[۵] اس بارے میں مزید تفصیل ہماری زیرِ طبع کتاب "اسلامی عقائد" میں ملاحظہ فرمائیں [۱] مشکوٰۃ ص ۳۷

جاوید غامدی صاحب کے مضمون "قانون میراث" کا تنقیدی جائزہ

چند قابلِ توجہ اُمور جاوید صاحب کے مضمون پر کچھ کلام کرنے سے پیشتر ہم چاہتے ہیں کہ چند اُمور کی طرف توجہ دلائیں۔

۱۔ جاوید صاحب اپنے مضمون میں جا بجا بلاغت کے اسالیب، اعلیٰ اسلوبِ بیان وغیرہ جیسے الفاظ اور لبید و اعشیٰ زہیر و امرأ القیس کا نام ذکر کرتے ہیں جس سے قاری کو یہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ پچھلے مفسّرین اور فقہاء غالباً ان اُمور سے نابلد تھے یا ان کا ادبی ذوق بلند نہ تھا اور جو پایا بھی جاتا ہے تو وہ محض بعض مولدین مثلاً متنبی وغیرہ کا تابع ہے اور یہ کہ ان چند لوگوں نے (مثلاً مولوی امین احسن اصلاحی اور جاوید احمد وغیرہ نے) قرآن فہمی کا اصل طریقہ اب کہیں دوبارہ دریافت کیا ہے جس کی بناء پر ان پر فقہاء اور (فقہاء کی پیروی کی وجہ سے) اصحاب تاویل وغیرہ کی اغلاط منکشف ہوتی ہیں۔

جاوید صاحب کی یہ بات اُصولی طور پر غلط ہے۔ علوم عربیہ میں استشہاد صرف جاہلی و مخضرمی ادب سے ہو سکتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص کل قرآن پاک کی تفسیر کرتا ہو یا اس کی بعض آیات کی تفسیر کرتا ہو اور وہ علوم عربیہ سے غافل ہو اور بلاغت کے اسالیب سے نابلد ہو۔ علماء نے تفسیر کے لیے پندرہ علوم ضروری قرار دیے ہیں جن میں سے علوم عربیہ بھی ہیں۔

فاما ما یحتاجه التفسیر فامور الأول علم اللغة لان به یعرف شرح مفردات الالفاظ ومعلوماتها بحسب الوضع ولا یکفی الیسیر اذ قد یکون اللفظ مشترکا وهو یعلم احد المعنیین والمراد الآخر فمن لم یکن عالما بلغات العرب لا یحل له التفسیر کما قاله المجاهد الثانی معرفة الاحکام التی للکلم

تفسیر کے لیے چند اُمور ضروری ہیں۔ اوّل علم لغت کیونکہ اس سے مفرد الفاظ کی شرح ہوتی ہے اور وضع کے اعتبار سے ان الفاظ کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں اور علم لغت کا تھوڑا علم کافی نہ ہوگا، کیونکہ لفظ کبھی مشترک ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ تفسیر کرنے والا دو میں سے صرف ایک معنی سے باخبر ہو جبکہ آیت میں لفظ سے دوسرا معنی مراد ہو۔ تو جو شخص لغات عرب کا علم نہیں رکھتا اس کو تفسیر کرنا جائز نہیں جیسا کہ مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے۔

العربية من جهة افرادها وتركيبها ويوخذ ذلك من علم النحو۔

دوم کلمات عربیہ کے افراد و ترکیب کے اعتبار سے احکام کی معرفت ۔ یہ علم نحو سے حاصل ہوگی۔

الثالث علم المعانی والبیان والبدیع ویعرف بالاول خواص تراکیب الکلام من جهة افادتها المعنی وبالثانی خواصها من حیث اختلافها وبالثالث وجوه تحسین الکلام وهو الرکن الاقوم واللازم الاعظم فی هذا الشان کما لا یخفی ذلک علی من ذاق طعم العلوم ولو بطرف اللسان

سوم علم معانی اور علم بیان اور علم بدیع، علم معانی کی وجہ سے افادہ معنی کے اعتبار سے کلام کی ترکیبوں کے خواص معلوم ہوتے ہیں۔ علم بیان کے ذریعہ افادہ معنی میں اختلاف کے اعتبار سے ترکیبوں کے خواص معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی کلام کا ظہور و خفاء تشبیہ و کنایہ کا علم ہوتا ہے۔ اور ثالث تحسین کلام کے طریقے معلوم ہوتے ہیں اور یہ اس معاملے میں رکن اقوم اور لازم اعظم ہے جیسا کہ اس شخص پر مخفی نہیں جس نے علوم کا ذائقہ چکھا اگرچہ نوک زبان سے ہی سہی۔

اور مفسرین تو ایک طرف رہے وہ لوگ جو مجتہدین و فقہاء میں شمار ہوتے ہیں ادب عربی میں اُن میں سے بہت سوں کا بلند مقام رہا ہے۔ امام محمد بن الحسن رحمہ اللہ کے بارے میں علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں وکان اعلم الناس بکتاب اللہ ماهرا فی العربیة والنحو والحساب وعن ابی عبید ما رأیت اعلم بکتاب اللہ من محمد بن الحسن (لوگوں میں کتاب اللہ کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ عربیت نحو اور حساب میں ماہر تھے۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن الحسن سے زیادہ کتاب اللہ کا عالم کسی کو نہیں دیکھا۔)

اسی طرح صاحب ہدایہ علی بن ابی بکر بن عبدالجلیل الفرغانی المرغینانیؒ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ کان اماما فقیها حافظا محدثا مفسرا جامعا للعلوم . . . ادیبا شاعرا لو تر العیون مثله فی العلم والادب (وہ امام فقیہ حافظ محدّث مفسّر اور جامع العلوم تھے۔ ۔ ۔ ادیب اور شاعر تھے۔ علم و ادب میں آنکھوں نے ان کی مثل کوئی نہیں دیکھا)

اور یہ کبھی نہیں ہوا کہ کوئی شخص ادب عربی کا ماہر سمجھا گیا ہو۔ حالانکہ وہ ادب جاہلی اور اس کی

بلاغت کے اسالیب سے بے خبر ہو۔ جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی تو اب یہ اندازہ کرنا مشکل نہ ہوگا کہ جاوید صاحب اپنی اس عبارت سے کہ فقہ وادب کے دائرے چونکہ الگ الگ ہوتے ہیں اس لیے احکامی آیات کے بعض مقتضیات کو سمجھنے میں فقہاء کی غلطیاں بڑی مشکل پیدا کر دیتی ہیں ... لوگوں کو مغالطہ میں مُبتلا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۲۔ آیات میراث کے بارے میں جاوید صاحب نے بار بار کہا ہے کہ ان میں اسلوب وہ ہے جو ہر زبان کا ہوتا ہے۔ مثلاً میزان حصّہ اوّل کے صفحہ ۴۸ پر لکھتے ہیں "کلام کا جو اسلوب یہاں اختیار کیا گیا ہے وہ عربی زبان ہی کے ساتھ خاص نہیں۔ دُنیا کی ہر زبان میں عام ہے ..." نیز صفحہ ۵۷ پر ہے "اس مفہوم کے لیے جمع کا یہ اسلوب ہر زبان میں عام ہے۔" اسی وجہ سے اُنھوں نے اُردو زبان میں مثالوں کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ جاوید صاحب کے اس قول وعمل کی بناء پر ہمیں بھی اختیار ہوگا کہ جہاں ضرورت سمجھیں اپنی زبان میں مثالوں کے ذریعے سے اپنی بات کی وضاحت کریں۔

بقیہ: توبہ کی ضرورت و اہمیّت

حج بیت اللہ کی ادائیگی

حج بھی بہت سے مردوں اور عورتوں پر فرض ہو جاتا ہے، لیکن حج نہیں کرتے جن پر حج فرض ہو یا پہلے کبھی ہو چکا تھا اور مال کو دوسرے کاموں میں لگا دیا وہ حج کرنے کی فکر کریں جس طرح ممکن ہو اس فریضے کا بوجھ اپنے ذمّہ سے ساقط کر دیں۔

اگر کسی پر حج فرض ہُوا اور اُس نے حج نہیں کیا اور اتنی زیادہ عمر ہوگئی کہ سخت مرض یا بہت زیادہ بڑھاپے کی وجہ سے حج کے سفر سے عاجز ہو اور موت تک سفر کے قابل ہونے کی اُمّید نہ ہو تو ایسا شخص کسی کو بھیج کر اپنی طرف سے حج بدل کرا دے۔

اگر زندگی میں نہ کرا سکے تو وارثوں کو وصیّت کر دے کہ اس کے مال سے حج کرائیں، لیکن اُصول شریعت کے مطابق وصیّت صرف ۱/۳ مال میں جاری ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر بالغ ورثا اپنے حصّہ میں سے بخوشی مزید دینا گوارا کریں تو ان کو اختیار ہے۔

جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار و نظریات

ایک مختصر جائزہ

(قسط: ۲)

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد زید مجدہم
مدرّس و نائب مفتی و فاضل جامعہ مدنیہ

جاوید صاحب کی پہلی غلطی اور اس کا جواب

آیت یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین فان کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترک وان کانت واحدۃ فلھا النصف کے ذیل میں جاوید صاحب لکھتے ہیں۔

"اسلوب بیان کا یہ پہلو ملحوظ رہے تو یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی کہ اگر کوئی مال کسی نوع کے لیے مخصوص کیا جائے اور اس کی مختلف اصناف میں اس کی تقسیم کا طریقہ بھی بتا دیا جائے تو کسی ایک صنف کی غیر موجودگی میں سارا مال خود بخود باقی اصناف کا حق قرار پائے گا۔ اس اُصول کو ہم ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ دس روپے کی رقم فقیروں کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ فقیر مرد کا حصہ دو فقیر عورتوں کے برابر ہوگا تو اس میں یہ واضح ہے کہ فی الاصل رقم فقیروں کے لیے ہے۔ لہٰذا ان کی جماعت میں اگر فقیر مرد ہی ہوں گے تو ساری رقم ان میں تقسیم کر دی جائے گی، اور فقیر عورتیں ہی ہوں گی تو پھر بھی یہی کیا جائے گا۔ للذکر مثل حظ الانثیین اسی نوعیت کا جملہ ہے۔ اس سے اولاد میں تقسیم وراثت کے حکم کا ہر پہلو واضح ہو جاتا ہے۔ مرنے والے کی اولاد میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہو تو لڑکے کو لڑکی سے دونا ملے گا۔ اس سے زیادہ لڑکے اور لڑکیاں ہوں تو اس کا ترکہ اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ ہر لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رہے۔ اولاد میں صرف لڑکے یا لڑکیاں ہی ہوں تو سارا ترکہ دونوں

ہیں سے جو موجود ہوگا اسے دیا جائے گا۔" (میزان حصہ اوّل ص ۴۵)
جاوید صاحب کا یہ کلام بلا دلیل ہے اور بوجوہ ذیل غلط بھی۔

۱۔ آیت میں کسی مال کے اولاد کے لیے مخصوص ہونے کا ذکر نہیں۔ بلکہ اتنی بات ہے کہ پہلے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں وصیّت و ہدایت کرتا ہے اور اس سے اگلے جملے للذکر مثل حظ الانثیین میں غامدی صاحب کے مطابق اسلوب حذف پایا جاتا ہے۔
جس کو جاوید صاحب نے اپنے مضمون میں اس طرح ذکر کیا ہے۔

"اصول نحو کی رو سے اس جملے (یعنی للذکر مثل حظ الانثیین) میں راجع الی الاولاد محذوف ہے۔ اس کو کھول دیا جائے تو تالیف کلام یہ ہوگی یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر منھم مثل حظ الانثیین۔ غور کیجیے تو یہاں حذف کا وہی اسلوب ہے جو ولمن صبر و غفر ان ذلک لمن عزم الامور میں ہے۔" (ص ۴۵ میزان)

اس اسلوب کے مطابق بھی اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو (ذوی الفروض کے حصے نکالنے کے بعد) تقسیم ہونے والا باقی مال ان میں اس تناسب سے تقسیم ہو کہ لڑکے کو لڑکی سے دوگنا ملے۔

۲۔ جب ایک صنف کو دوسرے پر دوگنے کی ترجیح دی تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرنے والا دونوں صنفوں کو ایک ہی حصہ نہیں دینا چاہتا۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دو اصناف منفرد ہوں تو کیا حکم ہوگا؟ آخر ترجیح دینے کی کوئی وجہ تو ہوگی جو ممکن ہے حالت انفراد میں بھی موجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے فوراً بعد لڑکیوں کا جبکہ وہ تنہا ہوں وجہ بیان کیا۔

۳۔ جاوید صاحب نے یہاں یہ تو کہہ دیا کہ اولاد میں صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہوں تو سارا ترکہ دونوں میں سے جو موجود ہوگا اسے دیا جائے گا۔" لیکن قرآن پاک میں آگے تنہا لڑکیوں کے حصے کا بیان ہے اس کو انھوں نے مجبور ہو کر ترمیم (بالفاظ دیگر تنسیخ) پر محمول کیا۔ لکھتے ہیں" اولاد میں تقسیم وراثت کا حکم اگر ان الفاظ پر ختم ہو جاتا تو پھر بھی حصوں میں کوئی ابہام نہیں تھا، لیکن اگلے ہی جملے میں قرآن مجید نے للذکر مثل حظ الانثیین کے مختلف تضمنات میں سے ایک میں ترمیم کر دی ہے۔ ص ۴۵ ایضا

شاید ترمیم کا لفظ زیادہ ہلکا تھا جو جاوید صاحب نے تنسیخ کی جگہ پر اس کو بالکل

استعمال کیا، لیکن ترمیم یا تنسیخ کا قول کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تاریخ کا علم ہو جس سے مقدم و مؤخر کا پتہ چلے۔ جاوید صاحب نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا

حالانکہ علامہ ابوبکر جصاص رحمہ اللہ احکام القرآن میں فرماتے ہیں۔ یوصیکم اللہ فی اولادکم ھی آیۃ محکمۃ غیر منسوخۃ" (یہ آیت محکم غیر منسوخ ہے)

پھر جاوید صاحب نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ایک اور تضاد کا مظاہرہ کیا۔ لکھتے ہیں "اس کے بعد اگرچہ اکیلی لڑکیوں کا حصّہ متعیّن طریقے پر بیان کیا گیا ہے لیکن فان کن نساء فوق اثنتین کے آغاز میں حرف 'ف' دلیل ہے کہ یہ بہرحال پہلے جملے ہی کے ایک پہلو کی وضاحت ہے اس لیے اس کا حکم جملہ ماقبل سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ ص ۴۷

دیکھیے جاوید صاحب نے جس کو پہلے ترمیم کہا اس کو اب وضاحت کہہ رہے ہیں۔ واقعی ایسے فہم اَدب سے تو پچھلے فقہاء اور اصحاب تاویلِ عاجز ہی تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

جاوید صاحب کی دوسری غلطی اور اسکا جواب

جاوید صاحب لکھتے ہیں۔

"قرآن کی زبان میں اگر ہم ایک لڑکی اور دو یا دو سے زائد لڑکیوں کا حصّہ بیان کرنا چاہیں تو اس کے دو طریقے ہیں۔ ترتیب نزولی کے مطابق بیان کرنا پیشِ نظر ہو تو پہلے ایک اور اس کے بعد دو لڑکیوں کا حصّہ بیان کیا جائے گا۔ دو سے زائد کا حصّہ لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں جب ایک کے فوراً بعد دو کا حصّہ اس طرح بیان کیا جائے کہ دونوں حصّوں میں مقدار کے اعتبار سے فرق ہو اور اس کے بعد متکلم خاموش ہو جائے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دو سے زائد کا حکم بھی وہی ہے جو دو لڑکیوں کا ہے۔ اسی بات کو ہم ترتیب صعودی کے مطابق بیان کریں گے تو اس کے لیے فوق اثنتین او اثنتین کے الفاظ کا استعمال چونکہ عربیت کے خلاف ہوگا، اس لیے دو سے زائد لڑکیوں کا حصّہ بیان کرنے کے بعد ایک کا حصّہ بیان کر دیا جائے گا۔ اس اسلوب میں فوق اثنتین سے کلام کا آغاز خود اس بات پر دلیل ہوگا کہ اس سے پہلے اثنتین کا لفظ محذوف ہے۔ غور کیجیے تو اس حذف کا قرینہ بالکل واضح ہے۔ اس ترتیب کا حسن مقتضی ہے کہ فوق اثنتین سے پہلے اثنتین کا لفظ استعمال نہ کیا جائے۔ اور صحّت زبان کا تقاضا ہے کہ

فوق اثنتین سے بات شروع کی جائے تو بعد میں اثنتین مذکور نہ ہو۔ قرآن مجید نے یہ حصے یہاں ترتیب صعودی کے مطابق بیان کیے ہیں۔ اس لیے حذف کا یہ اسلوب ملحوظ ہے۔ سورہ نساء کی آخری آیت میں یہی حصے ترتیب نزولی کے مطابق بیان ہوئے ہیں، چنانچہ دیکھ لیجیے کہ وہاں اثنتین کے بعد فوق اثنتین کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے۔" ص ۴۷-۴۶

جاوید صاحب کی اس عبارت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ خیر سے ان کو ترتیب نزولی اور ترتیب صعودی کا مطلب معلوم نہیں۔ نزولی نزول سے ہے جو کہ اُوپر سے نیچے کو یا زیادہ سے کم کی طرف آنے کو کہتے ہیں اور صعودی صعود یعنی چڑھنے کو کہتے ہیں جو نیچے سے اُوپر یا کم سے زیادہ کی طرف ہوتا ہے۔ جاوید صاحب نے پوری بحث اس کے برعکس کی ہے۔

پھر ترتیب خواہ نزولی ہو یا صعودی ہو جاوید صاحب کا یہ کہنا کہ "جب ایک کے فوراً بعد دو کا حصہ اس طرح بیان کیا جائے کہ دونوں حصوں میں مقدار کے اعتبار سے فرق ہو اور اسکے بعد متکلم خاموش ہو جائے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دو سے زائد کا حکم بھی وہی ہے جو دو لڑکیوں کا ہے۔" اس میں دو احتمال ہیں۔

۱۔ یا تو یہ اُصول مسلم ہو اور اہل قواعد اس سے باخبر ہوں اور اس کو تسلیم کرتے ہوں اس صورت میں جاوید صاحب کو باحوالہ بات کرنی چاہیے تھی۔

۲۔ یا یہ اُصول جاوید صاحب نے قرآن میں غور و فکر کر کے نکالا ہے جو اہلِ عربیت کے قواعد کے خلاف ایک علیحدہ اُصول و قاعدہ ہے جس کے ساتھ قرآن منفرد ہے۔ اس صورت میں یہ جاوید صاحب کا دعوٰی ہے جو کہ عقلی یا قرآنی دلائل کا محتاج ہے اور جب جاوید صاحب خود فرماتے ہیں کہ "قرآن مجید جس زبان میں نازل ہوا ہے وہ لبید و اعشیٰ اور زہیر و امرأ القیس کی زبان ہے ص۴۶ اور جب وہ کلام عرب میں نظائر کی اتباع کو ضروری سمجھتے ہیں ص۶۱ تو جاوید صاحب پر یہ بھی لازم تھا کہ کلام عرب سے ایسے نظائر و شواہد پیش کرتے کہ جو اُن کے دعوٰی کی تائید و تصدیق کرتے۔

حاصل یہ ہے کہ یہ جاوید صاحب مذکورہ اسلوب کے بارے میں محض اپنا طبع زاد دعوٰی ہے جو کہ عقل کے مسلمہ قواعد کے خلاف ہے۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ ایک لڑکی ہو تو اس کا نصف حصہ ہے اور دو لڑکیاں ہوں تو ان کا حصہ دو تہائی ہے اور پھر آپ خاموش ہو جائیں تو سامع فوراً

چونکے گا اور آپ کی طرف سوال دراز کرے گا کہ جب ایک لڑکی کا اتنا حصّہ ہے اور دو لڑکیوں کا اس سے زیادہ ہے تو تین یا زائد لڑکیوں کا کتنا ہوگا۔ بلکہ اس کا گمان غالب یہ ہوگا کہ تین یا زائد لڑکیاں ہوں تو اُن کا مجموعی حصّہ دو تہائی سے زیادہ ہوگا

اسی طرح جب دو سے زیادہ لڑکیوں کے لیے دو تہائی حصّے کا ذکر ہو اور ایک لڑکی کے لیے نصف کا ذکر ہو تو یہ بات بدیہی ہے کہ سامع متکلم کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھے گا کہ اگر لڑکیاں فقط دو ہوں تو اُن کا حصّہ کتنا ہوگا۔ اور اپنے ذہن میں تو وہ یہی خیال کرے گا کہ مذکورہ حساب سے دو کا حصّہ نصف اور دو تہائی کے درمیان ہوگا۔

عقل کے مسلمہ قواعد کو بالائے طاق رکھ کر قرآن کی طرف ایسی بات منسوب کرنا تو قرآن کے ساتھ نادان کی دوستی ہے۔

پھر دیکھیے کہ حذف کے اس قرینے کی طرف جس کا ذکر غامدی صاحب کرتے ہیں کسی مفسّر اور امام لغت کی توجہ نہیں گئی۔ امام لغت زمخشری خود کشاف میں یہ سوال کرتے ہیں۔ ولم یذکر حکم البنتین فی حال الانفراد فما حکمھما و ما بالہ لم یذکر ؟ (دو لڑکیاں جبکہ منفرد ہوں اُن کا حکم ذکر نہیں کیا گیا تو ان دو کا کیا حکم ہے اور کیا وجہ ہے کہ یہ حکم ذکر نہیں کیا گیا؟

امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ احکام القرآن میں فرماتے ہیں۔ وقولہ عز وجل فان کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترک و ان کانت واحدۃ فلھا النصف فنص علی نصیب ما فوق الابنتین وعلی الواحدۃ ولم ینص علی فرض البنتین لان فی فحوی الآیۃ دلالۃ علی بیان فرضھما (ج ۲ ص ۸۰) (یہ ارشاد الٰہی دو سے زائد بیٹیوں کے اور ایک بیٹی کے حصّے پر نص ہے اور دو بیٹیوں کے حصّے کی تصریح نہیں کی گئی کیونکہ فحوی آیت میں ان کے حصّے پر دلالت موجود ہے۔)

علّامہ ابوبکر رازی رحمہ اللہ تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔ القسم الثانی ما اذا مات وخلف الاناث فقط بین تعالی انھن ان کن فوق اثنتین فلھن الثلثان و ان کانت واحدۃ فلھا النصف الا انہ تعالی لم یبین حکم البنتین بالقول الصریح واختلفوا فیہ (قسم ثانی اس بارے میں ہے کہ کوئی شخص مرجائے اور فقط لڑکیاں چھوڑ جائے تو اللہ تعالیٰ نے

بیان کیا کہ اگر وہ دو سے زائد ہوں تو اُن کے لیے دو تہائی ہے اور اگر وہ ایک ہو تو اس کے لیے نصف ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے قول صریح کے ساتھ دو بیٹیوں کا حکم بیان نہیں کیا۔ اور دو لڑکیوں کے حصّے میں اختلاف ہے۔)

یہی بات رُوح المعانی میں کہی گئی ہے۔

دو لڑکیوں کے حصّے میں اختلاف واقع ہُوا ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں

فعن ابن عبّاس انه قال الثلثان فرض الثلاث من البنات فصاعدا وأما فرض البنتين فهو النصف واحتج عليه بانه تعالىٰ قال فان كن نساء فوق اثنتين فلهن ثلثا ماترك۔

حضرت ابن عبّاس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اُنھوں نے فرمایا دو تہائی تین اور تین سے زائد بیٹیوں کا حصّہ ہے۔ رہا دو بیٹیوں کا حصّہ تو وہ نصف ہے اور اُنھوں نے اس سے دلیل پکڑی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فان کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ماترک (اور اگر عورتیں دو سے زائد ہوں تو اُن کے لیے ترکہ کا دو تہائی ہے۔)

وكلمة ان في اللغة الاشتراط وذلك يدل على ان اخذ الثلثين مشروط بكونهن ثلاثا فصاعدا وذلك ينفي حصول الثلثين للبنتين ؎

اور کلمہ اِنْ لغت میں شرط کے لیے ہوتا ہے۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ دو تہائی کا حصول اس شرط کے ساتھ ہے کہ لڑکیاں تین یا زائد ہوں۔ اور یہ بات دو لڑکیوں کے لیے دو تہائی کے حصول کی نفی کرتی ہے۔

؎ جمہور صحابہ و مجتہدین چونکہ حضرت عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہ کے قول سے متفق نہیں ہیں لہٰذا اُن کی طرف سے یہ چند جواب ہیں۔

الاوّل ان هذا الكلام لازم على ابن عبّاس — اوّل۔ یہ بات خود حضرت ابن عبّاس رضی اللہ عنہ

←

دیکھیے یہ حضرت عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہما ہیں۔ علمائے صحابہ میں سے ہیں۔ حبر الامہ ہیں۔

لانه تعالى قال وانكانت واحدة فلها النصيف فجعل حصول النصف مشروطا بكونها واحدة و ذلك ينفى حصول النصف نصيبا للبنتين و هو قد جعل النصف نصيبا للبنتين فثبت ان هذا الكلام ان صح فهو يبطل قوله

کے خلاف جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وان کانت واحدۃ فلھا النصف اس آیت میں نصف کا حصول اس شرط کے ساتھ ہے کہ لڑکی صرف ایک ہو اور یہ اس بات کے منافی ہے کہ دو بیٹیوں کو نصف بطور حصّہ حاصل ہو جبکہ ابن عبّاس رضی اللہ عنہ نصف کو دو بیٹیوں کا حصّہ بناتے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہُوا کہ اگر ابن عبّاس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا دلیل صحیح ہو تو یہ خود اُن کے کلام اور دعوٰی کو باطل کرتی ہے۔

الثانى انا لا نسلم ان كلمة إنْ تدل على انتفاء الحكم عند انتفاء الوصف و يدل عليه انه لو كان الامر كذلك لزم التناقض بين هاتين الآيتين لان الاجماع دل على ان نصيب الثنتين اما النصف و اما الثلثان و بتقدير ان يكون كلمة ان للاشتراط

ثانی۔ ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ کلمہ ان انتفائے وصف کے وقت انتفائے حکم پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کو مان لینے کی صُورت میں ان دونوں آیتوں کے درمیان تناقض لازم آتا ہے۔ کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ دو بیٹیوں کا حصّہ یا تو نصف ہے یا دو تہائی ہے اور کلمہ اِن کو شرط کے معنی میں لینے سے یہ دونوں قول ثابت نہیں رہتے کیونکہ پہلی شرط کی وجہ سے دو تہائی حصّہ منتفی ہُوا اور دوسری شرط کی وجہ سے نصف حصّہ بھی منتفی ہُوا۔

علم تاویل ان کو حاصل ہے۔ عربیت اور بلاغت کے اسالیب سے خوب باخبر، لیکن انھوں نے

وجب القول بفسادهما فثبت ان القول بكلمة الاشتراط يفضي الباطل فكان باطلا ولانه تعالى قال فان لم تجدوا كاتبا فرهان مقبوضه وقال لا جناح عليكم ان تقصروا من الصلاة ان خفتم ولا يمكن ان يفيد معنى الاشتراط في هذه الآيات

پس ثابت ہوا کہ کلمہ ان کو شرط کے معنی میں لینا بطلان کا باعث ہے۔ لہٰذا یہ قول خود باطل ہوگا۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات فان لم تجدوا کاتبا فرھان مقبوضۃ اور لاجناح علیکم ان تقصروا من الصلاۃ ان خفتم میں کلمہ ان کو شرط کے معنی میں لینا کسی طرح ممکن نہیں۔

الوجه الثالث في الجواب هو ان في الآية تقديما و تاخيرا والتقدير فان كن نساء اثنتين فما فوقهما فلهن الثلثان

تیسرا جواب یہ ہے کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے فان کن نساء اثنتین فما فوقھما فلھما الثلثان (اگر عورتیں دو یا زیادہ ہوں تو اُن کے لیے دو تہائی حصہ ہے)

اس تیسرے جواب کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے رُوح المعانی میں اس طرح سے ذکر کیا ہے۔

وقيل ان معنى الآية فان كن نساء اثنتين فما فوقهما الا انه قدم ذكر الفوق على الاثنتين كما روى عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه قال لا تسافر المرأة سفرا فوق ثلاثة ايام الا ومعها زوجها او ذو محرم لها فان معناه

یہ بھی کہا گیا کہ آیت کا معنی ہے فان کن نساء اثنتین فما فوقھما مگر یہ کہ فوق کے ذکر کو اثنتین پر مقدم کیا گیا ہے جیسا کہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت تین دن سے زائد سفر نہ کرے مگر یہ کہ اس کے ساتھ اس کا شوہر یا اس کا محرم ہو کیونکہ اس حدیث کا مطلب ہے کہ عورت تین

اس اسلوب کو نہیں پہچانا جس کو جاوید صاحب چودہ صدیوں کے بعد دریافت کر کے لاتے ہیں، اور اُنھوں نے دو لڑکیوں کے لیے دو تہائی تو کیا نصف ہی کا قول کیا۔ پھر ان پر اعتراض کرنیوالوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپ کی بات تو عربیت کے اسلوب کے خلاف ہے اور ہماری بات اس اسلوب کی وجہ سے بالکل واضح اور صاف ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کا جو تیسرا جواب ذکر کیا گیا ہے اس سے خوش فہمی نہ ہو کہ یہ تو تقریباً وہی بات ہے جو جاوید غامدی صاحب نے میزان میں ذکر کی ہے، کیونکہ یہاں ان سے اختلاف مسئلہ کے حکم میں نہیں ہے بلکہ اس کی دلیل میں ہے۔ غامدی صاحب نے ثلثین کے حذف کی دلیل فقط اسلوب بیان کو بنایا ہے جبکہ دیگر حضرات اس کے فرض کرنے کو اور دلائل موجود مانتے ہیں جیسا کہ امام رازی رحمہ اللہ ذکر کرتے ہیں۔

و اما سائر الامة (یعنی جمهور الصحابة والائمة) فقد اجمعوا على ان فرض البنتين الثلثان۔ قالوا وانما عرفنا ذلك بوجوه	دیگر اُمّت (یعنی جمہور صحابہ و ائمہ) کا اس پر اتّفاق ہے کہ دو بیٹیوں کا حصّہ دو تہائی ہے اُنھوں نے کہا کہ اس بات کو ہم نے چند وجوہ سے جانا۔
الاوّل قال ابومسلم الاصفهانی عرفناه من قوله تعالى للذكر مثل حظ الانثيين وذلك لان من مات وخلف ابنا و بنتا فههنا يجب ان يكون نصيب الابن الثلثين لقوله تعالى للذكر مثل حظ الانثيين۔ فاذا كان	اوّل۔ ابومسلم اصفہانی نے کہا ہم نے اس کو اللہ تعالیٰ کے قول للذکر مثل حظ الانثیین سے پہچانا اور یہ اس طرح کہ جو مر گیا اور ایک بیٹا اور ایک بیٹی چھوڑی تو یہاں واجب ہے کہ بیٹے کا حصّہ دو تہائی ہو بوجہ اس فرمان الٰہی کے للذکر مثل حظ الانثیین۔ تو جب

→

لا تسافر سفرا ثلاثة ايام فما فوقها والى ذلك ذهب من قال ان اقل الجمع اثنان۔	دن سے زائد سفر نہ کرے مگر یہ کہ اسکے ساتھ اسکا شوہر یا اسکا محرم ہو کیونکہ اس حدیث کا مطلب ہے کہ عورت تین دن اور اس سے زائد سفر نہ کرے اور اس بات کی طرف وہ لوگ گئے ہیں جن کا قول ہے کہ اقلِ جمع دو ہوتے ہیں۔

(بقیہ بر صـ۶۳)

اخبار الجامعہ

محمد عابد، متعلم جامعہ مدنیہ

○ ۲۹ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ کو مولانا اللہ وسایا صاحب سیکریٹری آل پارٹیز مرکزی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت پاکستان جامعہ تشریف لائے اور حضرت نائب مہتمم صاحب سے ملاقات کی۔

○ ۳ محرم الحرام ۱۴۱۹ھ بروز جمعرات حضرت نائب مہتمم صاحب مولانا قاضی عبداللطیف صاحب رحمہ اللہ کی تعزیت کے لیے جہلم تشریف لے گئے، وہاں آپ کے صاحبزادے مولانا قاری خبیب احمد صاحب سے تعزیت کی اور اُسی رات واپسی ہوئی۔

○ ۱۵ محرم الحرام ۱۴۱۹ھ بروز منگل کراچی سے جناب آفتاب صاحب تشریف لائے اور جامعہ کے تعلیمی و تعمیری احوال دیکھے اور خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔

○ ۲۴ محرم الحرام ۱۴۱۹ھ بروز جمعرات حضرت مولانا سید رشید میاں صاحب مدظلہم العالی مہتمم جامعہ امریکہ سے واپس تشریف لے آئے۔

○ ۲۷ محرم الحرام ۱۴۱۹ھ بروز اتوار سے جامعہ کے شعبہ کتب کے سہ ماہی امتحان شروع ہوئے۔

○ ۲۹ محرم الحرام ۱۴۱۹ھ بروز منگل سے جامعہ کے شعبہ حفظ کے سہ ماہی امتحان شروع ہوئے۔

بقیہ : جاوید غامدی صاحب کے افکار و نظریات

نصیب الذکر مثل نصیب الانثیین و نصیب الذکر هھنا هو الثلثان وجب لا محالة ان یکون نصیب الابنتین الثلثین

ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے اور مرد کا حصہ یہاں دو تہائی ہے تو لا محالہ واجب ہوا کہ دو بیٹیوں کا حصہ دو تہائی ہو۔

جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار و نظریات

"قانونِ میراث" کا تنقیدی جائزہ

(قسط:۳)

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد زید مجدہم
مدرّس و نائب مفتی و فاضل جامعہ مدنیہ

ان قوله تعالى للذكر مثل حظ الانثيين يفيد ان حظ الانثيين ازيد من حظ الانثى الواحدة و الالزم ان يكون حظ الذكر مثل حظ الانثى الواحدة و ذلك على خلاف النص واذا ثبت ان حظ الانثيين ازيد من حظ الواحدة فنقول وجب ان يكون ذلك هو الثلثان لانه لاقائل بالفرق

ثانی قول الٰہی للذکر مثل حظ الانثیین سے یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ دو لڑکیوں کا حصّہ ایک لڑکی کے حصّہ سے زیادہ ہو، ورنہ لازم آئے گا کہ ایک لڑکے کا حصّہ ایک لڑکی کے حصّے کے برابر ہو حالانکہ یہ بات نص کے خلاف ہے اور جب ثابت ہے کہ دو لڑکیوں کا حصّہ ایک لڑکی کے حصّے سے زائد ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کا دو تہائی ہونا واجب ہے کیونکہ فرق کا کوئی قائل نہیں ہے۔

الثالث انا ذكرنا فى سبب نزول هذه الآية انه عليه السلام اعطى بنتى سعد بن الربيع الثلثين وذلك يدل على ما قلناه

ثالث اس آیت کے سبب نزول میں ہم نے ذکر کیا کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے سعد بن الربیع کی دو بیٹیوں کو دو تہائی دیا۔ یہ ہمارے قول پر دلیل ہے۔

جمہور صحابہ اور ائمہ مجتہدین جن میں تفسیر قرآن کی شرائط بھی پائی جاتی تھیں نے اور دلائل بھی ذکر کیے ہیں، لیکن وہ دلیل جو جاوید صاحب نے دی ہے اس کو کسی نے بھی ذکر نہیں کیا حالانکہ

جاوید صاحب کے بقول "اس حذف کا قرینہ بالکل واضح ہے"۔ کیا یہ تعجّب کی بات نہیں کہ جو قرینہ بالکل واضح ہو وہ چودہ صدیوں تک کسی کو نظر نہ آیا ہو بلکہ اب بھی اس کو تسلیم کرنا دُشوار ہو رہا ہو۔

علّامہ آلوسی رحمہ اللہ حضرت عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہما کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان سے رجوع ثابت ہے۔

ولعله لم يبلغه رضی الله تعالی عنه ذلك (الحديث الصحيح) كما قيل۔ فقال ما قال۔ وفی شرح الينبوع نقلا عن الشريف شمس الدين۔ الارمونی انه قال فی شرح فرائض الوسيط صح رجوع ابن عبّاس رضی الله تعالی عنه عن ذلك فصار اجماعا وعليه فيحتمل انه بلغه الحديث أو انه امعن النظر فی الآية ففهم منها ما عليه الجمهور فرجع الی وفاقهم	شاید کہ ابن عبّاس رضی اللہ عنہ کو یہ صحیح حدیث نہیں پہنچی جیسا کہ ایک قول ہے لہٰذا اُنھوں نے وہ قول اختیار کیا۔ شرح ینبوع میں شریف شمس الدین الاَرمُونی سے منقول ہے کہ اُنھوں نے شرح فرائض وسیط میں فرمایا کہ ابن عبّاس رضی اللہ عنہ کا اس قول سے رجوع صحیح سند سے ثابت ہے تو یہ اجماع ہوگیا۔ بنا بریں احتمال ہے کہ ان کو حدیث پہنچ گئی یا یہ کہ اُنھوں نے آیت میں (مزید) غور کیا اور اس سے انھوں نے جمہور کے مسلک کو سمجھ لیا اور اُن کے ساتھ اتّفاق کرلیا۔

حاصل یہ ہے کہ اگرچہ غامدی صاحب نے حکم تو صحیح بتایا ہے لیکن اس کے لیے جو دلیل لائے ہیں وہ خود اُن کا دعوٰی بلا دلیل ہے اور فقہاء و مجتہدین اگرچہ وہ صحابہ و تابعین ہی ہوں ان پر طعنہ زنی کا موقع نکال لیا۔

جاوید صاحب کی تیسری غلطی اور اسکا جواب

اگلی بحث جو جاوید صاحب نے کی ہے وہ یہ ہے کہ تنہا لڑکیوں کی صورت میں اُن کا حصّہ پورے ترکہ میں سے نہیں ہوگا بلکہ ذوی الفروض کا حصّہ نکالنے کے بعد باقی بچنے والے مال کا

نصف یا دو تہائی ہوگا۔ لکھتے ہیں۔

"کلام کا جو اسلوب یہاں اختیار کیا گیا ہے وہ عربی زبان ہی کے ساتھ خاص نہیں دُنیا کی ہر زبان میں عام ہے۔ ہم اس کو اپنی زبان کی ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ کوئی شخص اپنے کسی عزیز کو کوئی متعیّن رقم دیتے ہوئے کہتا ہے۔ یہ روپے بچّوں میں اس طرح تقسیم کر دیے جائیں کہ ایک لڑکے کا حصّہ دو لڑکیوں کے برابر ہو۔ آپ کے ہاں لڑکیاں ہی ہوں تو ان کا حصّہ دو تہائی ہوگا اور آپ کے اَبّا اگر موجود ہوں تو آدھی رقم اُنھیں دے دیجیے گا۔" ان جملوں پر غور کیجیے ان سے قائل کا مقصد بالکل واضح ہے۔ جو شخص بھی زبان آشنا ہوگا۔ وہ ان سے یہی مطلب سمجھے گا کہ روپے درحقیقت بچّوں کے لیے دیے گئے ہیں۔ دینے والے نے اگر ان کے علاوہ کسی اور کو کچھ دینے کے لیے نہیں کہا ہے تو یہ رقم اس کی ہدایت کے مطابق تقسیم کر دی جائے گی اور اگر کسی کو کچھ دینے کی ہدایت کی ہے تو اس کا حصہ دینے کے بعد باقی روپیہ بہرحال ان میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ وہ یہ بات بھی بغیر کسی تکلف کے سمجھ لے گا کہ لڑکیاں اگر اکیلی ہیں تو ان کو بھی والد کی موجودگی میں اس کا حصّہ دینے کے بعد باقی روپے کا دو تہائی ہی دیا جائے گا۔ اس کے سوا ان جملوں کا کوئی اور مفہوم کسی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔۔ الخ ص ۴۸

غامدی صاحب قرآن کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اُنھوں نے جو مثال بیان کی ہے اس کا ایک جملہ یُوں بنایا ہے۔ "آپ کے ہاں لڑکیاں ہی ہوں تو اُن کا حصّہ دو تہائی ہوگا۔" حالانکہ قرآن پاک میں اس کی تصریح ہے کہ ان کو کل ترکہ کا دو تہائی ملے گا۔ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ

لہٰذا غامدی صاحب کو مثال یُوں بنانی چاہیے تھی "کہ آپ کے ہاں لڑکیاں ہی ہوں تو اُن کا حصّہ کل مال کا دو تہائی ہوگا۔" غامدی صاحب اگر اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے تو جو نتیجہ انھوں نے اپنے من مانے ذریعے سے بلا تکلف نکال لیا ہے وہ ان کے لیے اتنا آسان نہ ہوتا اور کچھ نہیں تو وہ امام اللغۃ علّامہ زمخشری کی کشاف ہی دیکھ لیتے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"والضمير فى ترك للميت لان الآية لما كانت فى الميراث علم ان التارك هو الميت (ترك) میں ضمیر میت کے لیے ہے۔ کیونکہ جب آیت میراث کے مسائل

بتانے کے لیے ہے تو معلوم ہُوا کہ مال چھوڑنے والے سے میّت مُراد ہے)۔ لہٰذا ثُلُثَا مَاتَرَكَ کا اس کے _____ علاوہ اور کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ میّت نے جو کل ترکہ چھوڑا ہے اس کا دو تہائی لڑکیوں کے لیے ہوگا۔ اور خود غامدی صاحب نے مَاتَرَكَ کا ترجمہ یُوں کیا ہے "ترکہ کا دو تہائی" جو ہمارے بیان کیے ہُوئے معنی کے صریح مطابق ہے۔

اب مثلاً میّت کے وارثوں میں ایک شوہر ہو والد اور والدہ ہوں اور دو بیٹیاں ہوں تو ترکہ میں شوہر کا چوتھائی حصّہ والد اور والدہ میں سے ہر ایک کا چھٹا حصّہ اور دو بیٹیوں کا دو تہائی حصّہ ہوگا۔ لہٰذا اگر ہم اصل مسئلہ بارہ ۱۲ کو بتائیں تو شوہر کو تین والد اور والدہ کو دو دو اور دو بیٹیوں کو آٹھ حصّے ملیں گے۔ یہ سب ملا کر پندرہ حصّے بنتے ہیں۔ اب دُشواری یہ ہُوئی کہ بارہ میں سے پندرہ حصّے نہیں نکل سکتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس دُشواری کا یہ حل نکالا کہ پندرہ ہی کو اصل مسئلہ بنا لو۔ اسی حل کو عول کا نام دیا گیا ہے اور یہ حل ریاضی کے قواعد کے عین موافق ہے۔ بعد کے فقہاء اور مجتہدین نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسی حل کو اختیار کیا ہے۔

غامدی صاحب فقہاء پر طعنہ زنی کے خواہاں ہیں۔ مسئلہ عول کی مخالفت میں ان کو حضرت عبد اللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہاتھ آ گیا اس لیے ان کی طبیعت خُوب کھل گئی اور خُوب دل کی بھڑاس نکالی۔ لکھتے ہیں۔

"کسی رقم میں سے دو تہائی اور نصف بیک وقت ادا کرنا کسی طرح ممکن نہیں تقسیم کی یہ صُورت اُنگلی اُٹھا کر بتا دیتی ہے کہ لڑکیوں کا یہ حصّہ بھی باقی روپے ہی میں سے دیا جائے گا۔ بڑا ظلم کرے گا وہ شخص جو ان جملوں کا یہ مطلب سمجھے کہ قائل نے لڑکیوں کو بہر حال پوری رقم کا دو تہائی دینے کے لیے کہا ہے۔ اور چونکہ اس ہدایت کے مطابق روپے کو تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ذوا ضعاف اقل نکال کر حصّوں میں ایک جیسی کمی کر دینی چاہیے۔ کلام کا یہ منشا اگر کوئی کہنے والے سے منسوب کرتا ہے تو اس سے اپنی سخن ناشناسی ہی کا ثبوت نہیں دیتا۔ قائل کے بارے میں بھی دوسروں کو یہ رائے قائم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ پہیلیوں کی زبان میں بات کرتا ہے۔ ص ۴۹

آگے لکھتے ہیں

"فقیہانِ کرام اس بات پر متفق ہیں کہ لڑکیوں کے حصے بہر صورت پورے ترکے میں سے دیے جائیں گے۔ ان حضرات کی یہی غلطی ہے جس کی وجہ سے انہیں عول کا وہ عجیب و غریب قاعدہ ایجاد کرنا پڑا ہے جس کو ماہرین فقہ و قانون کی بوالعجبیوں میں قیامت تک بلند ترین مقام حاصل رہے گا کسی شخص نے کبھی علمی دنیا کے اعجوبوں کی تاریخ مرتب کرنا شروع کی تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے علمِ میراث کی یہ یادگار اس میں سرفہرست ہوگی۔" ص۵۰

جیسا کہ ہم نے بتایا کہ جاوید صاحب نے فقہاء کے بارے میں اپنی عداوت کو اسلوب بیان کے پردے میں چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اس پر ان کی اگلی عبارات بھی دلالت کرتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"حیرت ہوتی ہے کہ اسلوب بیان کی نزاکتوں کو سمجھنے اور آیات پر غور و تدبّر کرنے کے بجائے ان حضرات نے یہ چیستان اللہ تعالیٰ سے منسوب کر دیا ہے اور اس کی دریافت کا سہرا حضرت عمرؓ کے سر باندھا ہے۔ اس پر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائے۔" ص۵۰

تماشا یہ ہے کہ آپ جاوید صاحب کا پورا مضمون پڑھ جائیے کہیں اس اسلوب بیان کی تفصیل نہیں ملے گی۔ اسلوب بیان، بلاغت اور چند دیگر الفاظ کی تکرار اور لبید و اعشیٰ کا ذکر کر کے بعض عوام میں تو اپنی ادبیت اور قرآن فہمی کا تصوّر بٹھایا جا سکتا ہے، لیکن فنی طور پر گفتگو کرنے کے لیے تو محض اتنا کافی نہیں اس کے لیے تو دلائل و نظائر پیش کرنے ہوتے ہیں جن سے جاوید غامدی صاحب خود تہی دامن نظر آتے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے عافیت اسی میں جانی کہ اسلوب بیان اور بلاغت کو بھی تجریدی ABSTRACT آرٹ ہی کی ایک قسم بنا دیا جائے۔ اسی لیے فرماتے ہیں۔

"ہم نے اوپر اپنی تاویل کے جو دلائل دیے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلّق اُصول بلاغت سے ہے اور بلاغت وہ چیز نہیں جسے اُصول نحو اور قواعدِ ریاضی کی طرح دو اور دو چار کر کے بیان کیا جا سکے۔ اس کا تعلّق ذوق و وجدان سے ہے . . . فقروں کی عام نحوی تالیف سے

ہم اس کے مقصد و مدعا تک نہیں پہنچ سکتے، لیکن ایک ادب شناس اور صاحبِ ذوق سامع اس کلام کو سُن کر متکلم کے مافی الضمیر کو اس طرح پا لیتا ہے کہ ع

مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تقسیم وراثت کی ان آیات کو میں جس طرح سمجھتا ہُوں مَیں نے اُوپر بیان کر دیا ہے۔ میں جب ان آیات کو پڑھتا ہوں تو کلام کا یہ مفہوم[1] بغیر کسی تکلّف کے میرے سامنے آجاتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مَیں ان کو واضح کرنے سے قاصر رہا ہوں مَیں اپنے قلم کے عجز[2] کا اعتراف کرتا ہوں، لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ان آیات کو بار بار پڑھے گا یوصیکم اللہ فی اولادکم سے کلام کے آغاز کو نگاہ میں رکھتے ہُوئے ان کی تلاوت کرے گا۔ ولابویہ میں حرف واوٗ اور فان کن نساء میں حرف ف کی دلالت کو سمجھنے کی کوشش کرے گا تو اس تاویل تک پہنچنے میں اُسے کوئی دقت نہیں ہوگی۔

نحو و بلاغت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ وجوہ اعراب کو ہم سمجھ لیتے ہیں اور بیان بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اسالیب کی بہت سی ندرتوں کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مطالعہ ادب کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس میں وہ مقام بھی آتا ہے کہ جہاں ع

آدمی محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں" (ص۵۰ ص۵۱ میزان)

ہم کہتے ہیں کہ جاوید غامدی صاحب نے ان طول طویل عبارتوں کے ذریعے سے کم از کم قرآن پاک کے اس مقام کو ایک چیستان بنا کر رکھ دیا ہے کہ ان کا سا ذوق نہ رکھنے والے اس کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

---

[1] کلام کا مفہوم حقیقت میں یا تو وہ ہے جو جاوید صاحب نے سمجھا ہے یا وہ ہے جو فقہاء ذکر کرتے ہیں اسی کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس فیصلہ کا دارو مدار دلائل پر ہے نہ کہ محض کسی کے فہم پر۔ اور دلائل میں موازنہ کرنے سے جاوید صاحب کی غلطی ادنیٰ تامل سے عیاں ہو جاتی ہے۔

[2] خیال رہے کہ یہ قصور و عجز اس بناء پر نہیں ہے کہ جاوید صاحب اپنے اندر کوئی کمی پاتے ہیں بلکہ اس کا ذمہ دار بھی اُنھوں نے اسالیب کلام کو ٹھہرایا ہے لکھتے ہیں کہ "اسالیب کی بہت سی ندرتوں کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

الحاصل جب باپ کی موجودگی میں بھی دو اور زائد لڑکیوں کو کل ترکہ کا دو تہائی ملنا قرآن پاک سے عبارت النص کے طور پر ثابت ہے تو جاوید صاحب کی یہ بات بھی کتنی عجیب اور بناء فاسد علی الفاسد ہے کہ "غور کیجیے تو اس حدیث سے یہ دعوٰی کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ اکیلی لڑکیوں کو بہرحال پورے ترکے کا دو تہائی دیا جائے گا۔"

جاوید صاحب کے اس اعتراض کو ہم تفصیلاً ذکر کر رہے ہیں اور اس میں جاوید صاحب کی غلطی کے منشا پر دوبارہ تنبیہ کر دیں گے۔ جاوید صاحب لکھتے ہیں۔

"ہمارے فقہاء اس باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث بالعموم نقل کرتے ہیں اسے ابوداؤد نے کتاب الفرائض میں جابر بن عبداللہؓ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے۔

عن جابر بن عبد الله قال خرجنا	جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ ہم رسول
مع رسول الله صلى الله عليه وسلم	اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے تو
حتى جئنا امرأة من الانصار	بازار میں ایک انصاری خاتون سے
في الاسواق فجاءت المرأة بابنتين	ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ دو بچیاں
لها فقالت يا رسول الله	بھی تھیں۔ انھوں نے کہا اے اللہ کے
هاتان بنتا ثابت بن قيس	رسول یہ ثابت بن قیسؓ کی بیٹیاں ہیں
قتل معك يوم احد و	جو احد کے دن آپ کی معیت میں لڑتے
قد استفاء عمهما مالهما	ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کے چچا نے اُن کا
و ميراثهما كله فلم يدع	سارا مال لے لیا۔ اس نے ان کے لیے کچھ
مالا الا اخذه فما ترى يارسول	بھی نہیں چھوڑا۔ تو اے اللہ کے رسول اس
الله ؟ فوالله لا تنكحان ابدا	کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ بخدا
الا ولهما مال ۔ فقال	ان کے پاس مال نہ ہوا تو ان کے نکاح کبھی
رسول الله صلى الله عليه وسلم	نہیں ہو سکیں گے۔ حضور نے فرمایا اللہ
يقضي الله في ذلك قال و نزلت	اس باب میں فیصلہ کریں گے۔ جابر بیان
سورة النساء يوصيكم الله في اولادكم	کرتے ہیں کہ اس کے بعد سورہ نساء کی آیت

الآیۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادعوا لی المرأۃ وصاحبہا فقال لعمہما اعطہما الثلثین واعط امہا الثمن وما بقی فلك۔

میراث نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت اور لڑکیوں کے چچا کو بلایا اور اُن کے چچا سے کہا ان دونوں کو دو ثلث اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دے دو۔ اس کے بعد جو کچھ بچے وہ تمہارا ہے۔

غور کیجیے تو اس حدیث سے یہ دعویٰ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ اکیلی لڑکیوں کو بہر حال پورے ترکے کا دو تہائی دیا جائے گا۔ کسی کلام کا مفہوم متعیّن کرنے میں اس کا سیاق اور قائل کا لب و لہجہ دلیل فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس حدیث کا اسلوب ملحوظ رہے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم یہاں مرنے والی بیوی اور اس کی لڑکیوں میں ترکے کی تقسیم کا طریقہ بیان نہیں فرما رہے ہیں۔ لب و لہجے ہی سے واضح ہے کہ آپ درحقیقت لڑکیوں کے چچا سے ان کا اور ان کی ماں کا وہ حصّہ دلوا رہے ہیں جو قرآن مجید نے متعیّن فرمایا ہے۔ قرآن مجید کا منشا ہم اُوپر دلائل کے ساتھ واضح کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس حدیث میں الثلثان اور الثمن دونوں پر لام عہد کا ہے۔ قرآن مجید نے تقسیم وراثت کے جو اُصول بیان کیے ہیں۔ ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ نے لڑکیوں کے چچا کو ہدایت فرمائی کہ لڑکیوں کا ان کا مخصوص دو ثلث اور ان کی ماں کو اس کے لیے مخصوص آٹھواں حصّہ دے دو۔ اس کے بعد جو کچھ بچے وہ تم لے سکتے ہو۔ اس اسلوب میں یہ مضمر ہے کہ مرنے والے کی بیوی اور اس کی لڑکیوں کے یہ حصّے قرآن کے احکام کے مطابق دیے جائیں۔" (میزان ص۵۱ تا ص۵۳)

فقہاء پر جاوید صاحب کے اس اعتراض کا جواب تو اگرچہ پہلے ہی واضح ہو چکا ہے لیکن ہم ایک مرتبہ پھر اس پر تنبیہ کیے دیتے ہیں۔ جب قرآن پاک ہی میں یہ ہے۔

فان کن نساء فوق اثنتین فلہن ثلثا ما ترك

پھر اگر اولاد میں لڑکیاں ہی ہوں اور وہ دو سے زیادہ ہوں تو انہیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔ (میزان ص۴۴)

یعنی دو اور دو سے زائد لڑکیوں کے لیے ترکہ کا دو تہائی ہے۔ اس مضمون کو خواہ عربی میں

ذکر کیجیے کہ ثلثا ما ترک یا اُردو میں یوں کہیے کہ "ترکے کا دو تہائی" یہ الفاظ اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ لڑکیوں کو کل ترکہ کا دو تہائی دینا مراد ہے اور اس مضمون کو خواہ کسی بھی اسلوب سے بیان کیجیے اس معنی میں قطعاً تغیر نہیں آئے گا۔ تو جب قرآن پاک ہی کی رو سے دو اور زائد لڑکیوں کے لیے کل ترکہ کا دو تہائی ہے۔ یعنی ما ترک کا دو تہائی ہے ما بقی (بقیہ ترکہ) کا دو تہائی نہیں تو حدیث میں لام عہد کے ہونے ہی کی صورت میں الثلثین سے مُراد مخصوص دو ثلث یعنی ما ترک (جو کہ کل ترکہ ہے) کا دو ثلث ہے اور الثمن سے مُراد مخصوص آٹھواں حصّہ یعنی کل ترکہ کا آٹھواں حصّہ مراد ہے اور فقہاء بھی یہی کہتے ہیں۔

بقیہ: سیّدنا عمرؓ کا قبولِ اسلام

بھنک اُن کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ عمرؓ جیسے مکان میں داخل ہوئے، پُوچھا تم کیا پڑھ رہے تھے؟ بہن اور بہنوئی نے بات کو ٹالنا چاہا۔ لہٰذا کچھ خاموش رہے۔ عمرؓ نے اسی تیزی میں کہا: "میں نے سُنا ہے کہ تم دونوں صابی (بے دین) ہو گئے ہو؟" بہنوئی سعید بن زیدؓ نے کہا: "عمر! اگر تمہارا دین حق نہ ہو بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا دین حق ہو تو بتلاؤ کیا کرنا چاہیے؟ بہنوئی کے اس جواب نے عمرؓ کے غصّہ کو اور تیز کر دیا اور وہ ان پر پل پڑے۔ بہن شوہر کو بچانے کے لیے آگے بڑھیں نے تو عمرؓ نے ان کو اس قدر مارا کہ چہرہ خُون سے تر بتر ہو گیا۔ اب بہن کو بھی جوش آ گیا۔ آخر وہ بھی عمرؓ کی بہن تھیں۔ بولیں: "اے خطاب کے بیٹے! تجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر لے ہم تو محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے دین کو قبول کر چکے ہیں۔

اے اللہ کے دُشمن! تو ہمیں اس لیے مارتا ہے کہ ہم اللہ کو ایک مانتے ہیں۔ خُوب جان لے، ہم اسلام کے حلقہ میں داخل ہو چکے ہیں اگرچہ تیری ناک خاک آلود ہو۔"

بہن کا یہ جوش سے بھرا ہُوا جواب سُن کر عمرؓ کچھ پسیجے اور غُصّے میں کچھ ٹھنڈک پیدا ہُوئی اور شرم آگیں لہجے میں کہا: "مجھے دکھاؤ تم کیا پڑھ رہے ہو؟" بہن نے کہا: "تم ناپاک ہو اور قرآن حکیم کو صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ جاؤ وضو کر کے آؤ۔"

(قسط ۴)

جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار و نظریات

"قانونِ میراث" کا تنقیدی جائزہ

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد زید مجدہم
مدرّس و نائب مفتی و فاضل جامعہ مدنیہ

اسی مسئلہ (یعنی عول اور دو زائد لڑکیوں کے لیے کل ترکہ کا دو تہائی ہونا) کے تحت جاوید غامدی صاحب نے جصاص رحمہ اللہ کی احکام القرآن سے ایک تبصرہ نقل کیا ہے۔ ہم اسے نقل کرکے آگے اس پر اپنا کلام کریں گے۔

جصاص اپنی کتاب کے 'باب العول' میں لکھتے ہیں

"عن عطاء بن ابی رباح قال سمعت ابن عبّاس ذکر الفرائض وعولها فقال أترون الذی احصی رمل عالج عددا جعل فی مال قسمه نصفا و نصفا و ثلثا فهذا النصف و هذا النصف فاین موضع الثلث۔ قال عطاء فقلت لابن عبّاس یا ابا عبّاس ان هذا لا یغنی عنك ولا عنی شیئا لومتَ اومتَ قسم میراثنا علی ما علیه القوم من خلاف رأیك و أیی۔ قال فان

عطاء بن ابی رباح بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابن عبّاس رضی اللہ عنہ کو فرائض اور ان میں عول کا ذکر کرتے ہوئے سنا وہ فرما رہے تھے، کیا تم لوگوں کا خیال ہے کہ جس نے ریت کے ذروں کو گن لیا وہ مال کی تقسیم نصف اور نصف اور ثلث میں کرے گا۔ پھر یہ نصف اور یہ نصف تو ثلث کا کیا محل ہے؟ عطا کہتے ہیں میں نے عرض کیا اے ابوعبّاس مجھے اور آپ کو اس کا کیا فائدہ۔ ہم دُنیا سے رُخصت ہوئے تو ہماری میراث بھی اسی طریقے کے مطابق تقسیم کی جائے گی جو لوگوں نے ہماری

شاءوا فلندع ابناءنا و ابناءهم و نساءنا ونساءهم و انفسنا وانفسهم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله على الكاذبين ما جعل الله فى مال نصفا و نصفا وثلثا۔

رائے کے خلاف اختیار کر رکھا ہے ابن عباسؓ نے یہ سُن کر فرمایا پھر ہم اور وہ خود بھی آجائیں اور اپنے بال بچّوں کو بھی لے آئیں اور مل کر دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پہ خدا کی لعنت ہو۔ اللہ نے کسی مال کی تقسیم نصف اور نصف اور ثلث میں نہیں کی۔ (میزان ص۵۳)

جاوید غامدی صاحب نے جصاص کی ـــ احکام القرآن سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا تنقید سے پُر تبصرہ تو نقل کر دیا، لیکن اس بات کی تحقیق کرنے یا نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ عول کی صورتوں میں خود حضرت ابن عبّاس رضی اللہ عنہ کیا فرماتے ہیں جس سے واضح ہوجاتا کہ یہ تبصرہ جاوید غامدی صاحب کو چنداں مفید نہیں۔

علم الفرائض کی مشہور کتاب سراجیہ کی شرح شریفیہ میں ہے۔

وسأله رجل كيف تصنع بالفريضة العائلة فقال ادخل الضرر على من هو اسوأ حالا وهى البنات والاخوات فانهن ينتقلن من فرض مقدر إلى فرض غير مقدر ـــــــــــ

ایک شخص نے ابن عبّاسؓ سے پُوچھا کہ آپ عول والے فریضہ میں کیا کرتے ہیں تو اُنھوں نے فرمایا کہ میں نقصان کو ان پر ڈالتا ہوں جو کمتر حالت والے ہیں اور وہ بیٹیاں اور بہنیں ہیں کیونکہ وہ متعیّن حصّے سے غیر متعیّن حصّے کی طرف منتقل ہوتی ہیں۔

ـــ و يؤيد كلامه انه اذا تعلقت حقوق بمالٍ لا يفى بها يقدم منها ماكان اقوى كالتجهيز والدين والوصية والميراث فاذا ضاقت التركة عن الفروض

ان کے کلام کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جب حقوق کسی مال کے ساتھ متعلّق ہوں اور وہ مال ان کو پُورا نہ ہو تو ان میں جو قوی تر حق ہوگا اس کو مقدم کیا جائے گا۔ مثلاً تجہیز اور دین اور وصیّت

يقدم الاقوى . ولا شك ان من	اور میراث ۔ تو جب ترکہ حصّوں سے کم ہو
ينقل من فرض مقدر الى	جائے تو قوی تر کو مقدم کیا جائے گا اور اس
فرض آخر مقدر يكون صاحب فرض	میں شک نہیں ہے کہ جو ایک متعیّن حصّے
من كل وجه فيكون اقوى	سے دوسرے متعیّن حصّے کی طرف منتقل
ممن ينقل من فرض	ہوتا ہے وہ ہر اعتبار سے حصّہ والا ہے لہٰذا
مقدر الى فرض غير مقدر	وہ قوی تر ہے بہ نسبت اس کے جو متعیّن حصّے
لانه صاحب فرض من وجه	سے غیر متعیّن حصّے کی طرف منتقل ہوتا ہے
وعصبة من وجه فادخال	کیونکہ یہ من وجہ حصّہ والا ہے اور من وجہ
النقص والحرمان عليه أولى	عصبہ ہے پس نقص و حرمان کو اس شخص
لان ذوى الفروض مقدمون	پر داخل کرنا اولیٰ ہے ۔ کیونکہ حصے والے
على العصبات ص ۵۵ (مطبع علیمی)	عصبات پر مقدم ہوتے ہیں ۔

اوّل تو ابن عبّاس رضی اللہ عنہ بھی پورے ترکہ میں سے دو لڑکیوں کے لیے دو تہائی حصّے کے قائل ہیں۔ اسی لیے وہ تقسیم کی ایک اور صورت نکالتے ہیں کہ کم تر حالات والے ورثا۔ جو کہ بیٹیاں اور بہنیں ہیں انکے حصّے میں کمی کر دی جائے ۔ نیز جاوید صاحب نے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ دیکھیں، عطا کہتے ہیں میں نے عرض کیا اے ابو عبّاس مجھے اور آپ کو اس کا کیا فائدہ ہم دُنیا سے رُخصت ہوتے تو ہماری میراث بھی اسی طریقے کے مطابق تقسیم کی جائے گی جو لوگوں نے ہماری رائے کے خلاف اختیار کر رکھا ہے (ص ۵۳ میزان) اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت باقی صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین عول کے قول کو اختیار کیے ہوئے تھے یہاں تک کہ عطا رحمہ اللہ کو اُمید نہ تھی کہ اور لوگ ان کی رائے سے موافقت کریں گے بلکہ اپنے خاندان والے بھی مخالف تھے۔

شریفیہ شرح سراجیہ میں حضرت عبد اللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہ کے قول کے جواب میں جمہور کی طرف سے یہ دلیل دی گئی۔

ولنا ان اصحاب الفروض	ہماری دلیل یہ ہے کہ ترکہ میں شریک حصّوں کے
المجتمعة فى التركة قد تساووا	اصحاب سببِ استحقاق میں برابر ہیں جب

فی سبب الاستحقاق وھو النص فیتساوون فی الاستحقاق وحینئذٍ یاخذ کل واحد منھم جمیع حقه ان اتسع المحل ویضر بجمیع حقه اذا ضاق المحل کالغرماء فی التركة فاذا اوجب الله تعالیٰ فی مال نصفین و ثلثا مثلا علم ان المراد الضرب لھذہ الفروض فی ذلك المال لاستحالة وفائه بھا بخلاف التجھیز و اخوته فانھا حقوق مرتبة کما سلف۔ والنقل من الفروض الی العصوبة لا یوجب ضعفا لان العصوبة اقوی اسباب الارث فکیف یثبت النقصان او الحرمان بھذا الاعتبار فی بعض الاحوال فاذن الحق ما علیه عامة الصحابة و جمھور الفقھاء۔

پر نص موجود ہے۔ لہٰذا یہ استحقاق میں برابر ہوں گے اور اس وقت اگر ترکہ میں وسعت ہو تو ان میں سے ہر ایک اپنا پورا حصہ لے گا، اور اگر ترکہ میں تنگی ہو تو سب کے حق میں کمی آئے گی جیسا کہ قرض میں قرض خواہوں کے ساتھ ہوتا ہے (مثلاً مقروض کے پاس صرف نو سو روپے ہیں جبکہ اس نے ایک کے چھ سو اور دوسرے کو بارہ سو واپس کرنے ہیں۔ تو یہ نو سو دونوں میں تناسب سے کمی کر کے چھ سو والے کو تین سو اور بارہ سو والے کو چھ سو روپے دیں گے) تو مثلاً جب اللہ تعالیٰ نے نصف اور دو تہائی کا ایجاب کیا اور ترکہ ان حصّوں میں پورا تقسیم نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ مراد ان حصّوں کو اس مال میں ضرب دینا ہے۔ تجہیز وغیرہ کا مسئلہ اس سے مختلف ہے کیونکہ ان حقوق میں ترتیب ہے (اکٹھے نہیں ہیں) اور فروض (مقرر حصّوں) سے عصبہ کی طرف منتقل ہونا ضعف کا سبب نہیں ہے کیونکہ عصوبت اسباب میراث میں سے قوی تر سبب ہے۔ تو اس اعتبار سے تو وہ نقصان یا محرومی کا سبب کیسے بن سکتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں حق وہی ہے جس کو عامہ صحابہ اور جمہور فقہاء نے اختیار کیا ہے۔

جاوید صاحب کا مقصد تو فقہاء پر طعنہ زنی تھی ورنہ دیانتداری تو یہ تھی کہ وہ یہ بھی دکھاتے کہ علامہ ابوبکر جصاص رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کے برعکس عامہ صحابہ اور جمہور فقہاء کے قول کو ترجیح دی ہے۔ جصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

والحجة للقول الأول ان الله تعالى قد سمى للزوج النصف وللاخت من الاب والام النصف وللاخوة من الام الثلث و لم يفرق بين حال اجتماعهم و انفرادهم فوجب استعمال نص الآية في كل موضع على حسب الامكان فاذا انفردوا واتسع المال لسهامهم قسم بينهم عليها واذا اجتمعوا وجب استعمال حكم الآية في التضارب بها۔ ومن اقتصر على بعض واسقط بعضا أو نقص نصيب بعض و وفى الآخرين كمال سهامهم فقد ادخل الـ على بعضهم مع مساواته للآخرين في التسمية فاما ما قاله ابن

قول اوّل کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شوہر کے لیے نصف ذکر کیا اور حقیقی بہن کے لیے بھی نصف ذکر کیا اور اخیافی بھائیوں کے لیے تہائی ذکر کیا۔ اور ان کے اجتماع و انفراد کی حالتوں کے مابین فرق نہیں کیا لہٰذا واجب ہے کہ آیت کی تصریح کے مطابق ہر موقع پر بقدر ممکن عمل کیا جائے جب وہ منفرد ہوں اور مال میں اُن کے حصّوں کے لیے وسعت ہو تو مال کو ان کے حصّوں کے درمیان حصّوں کے بقدر تقسیم کر دیا جائے گا اور جب وہ مجتمع ہوں تو آیت کے حکم پر حصّوں کے ساتھ ضرب دے کر عمل کیا جائے گا اور اس کے برعکس جو شخص بعض کو دے اور بعض کو سرے سے نہ دے یا بعض کے حصّے کو کم کر دے تو اس نے ان پر ظلم کیا کیونکہ حصّوں کے بیان میں ان (مظلوموں) کا ذکر دوسرے حصہ داروں کے مساوی ہُوا ہے۔ رہا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مقدم کیا اس کو پہلے دیا جائے گا اور جس کو مؤخر کیا تو مقدم

ابن عبّاس من تقديم من قدم الله تعالىٰ و تاخير من اخر فانما قدم بعضا و اخر بعضا وجعل له الباقى فى حال التعصيب فاما حال التسمية التى لا تعصيب فيها فليس واحد منهم اولى بالتقديم من الآخر الاترى ان الاخت منصوص على فرضها بقوله تعالى (وله اخت فلها نصف ما ترك) كنصه على فرض الزوج والام والاخوة من الام فمن اين وجب تقديم هؤلاء عليها فى هذه الحال۔ وقد نص الله تعالىٰ على فرضها فى هذه الحال كما نص على فرض الذين معها وليس يجب لان الله ازال فرضها الى غير فرض فى موضع ان يزيل فرضها فى الحال التى نص

والوں سے جو مال باقی بچے وہ اس کو دیا جائے گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ تقدیم و تاخیر اس حالت میں تو تسلیم شدہ ہے کہ مقرّرہ حصّوں والوں کو مقدم کیا اور عصبہ کو مؤخر کیا، لیکن حصّوں کے بیان کی وہ حالت جس میں سب مقرّرہ حصوں والے ہوں اور کوئی عصبہ نہ ہو تو پھر ایک کو دوسرے پر تقدیم حاصل نہیں ہوتی۔ کیا دیکھتے نہیں کہ بہن کے حصّے پر جہاں یہ آیت نص ہے۔ وله اخت فلها نصف ما ترك اسی طرح شوہر ماں اور اضافی (یعنی ماں شریک) بھائیوں کے حصّوں پر بھی نص موجود ہے۔ پس ان لوگوں کی بہن کے حصّے پر تقدیم کیوں کر واجب ہو گئی؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس حالت میں بہن کے حصّے کی تصریح کی ہے جیسا کہ ان لوگوں کے حصّوں کی تصریح کی جو اس کے ساتھ ہوں اور یہ واجب نہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک حالت میں بہن کے متعیّن حصّے کو غیر متعیّن کی طرف ہٹایا ہے تو دوسری حالت میں بھی اس کو اس متعیّن حصّے سے ہٹایا جائے جس کی تصریح نص میں کی گئی ہے۔ پس یہ قول میراث کے حصّوں والی آیتوں کے مخالف ہونے کی وجہ سے اس قول سے زیادہ شنیع ہے

علیه فیها فهذا القول اشنع فی مخالفة الآی التی فیها سهام المواریث من القول باثبات نصف و نصف و ثلث علی وجه المضاربة بها ولذلك نظائر فی المواریث من الاصول ایضا قال الله تعالیٰ رمن بعد وصیة یوصی بها أو دین) فلو ترك المیت الف درهم و علیه دین لرجل الف درهم ولآخر خمس مأة و لآخر الف کانت الالف المتروکة مقسومة بینهم علی قدر دیونهم و لیس یجوز ان یقال لما لم یمکن استیفاء الفین و خمس مأة من الف استحال الضرب بها۔ وکذلك لو اوصی رجل بثلث ماله لرجل بسدسه لآخر و لم تجز ذلك الورثة تضاربا فی الثلث بقدر وصایاهم لیضرب احدهما بالسدس والآخر بالثلث مع استحالة استیفاء النصف

جس میں نصف اور نصف اور تہائی کا تضارب کے طریقے پر اثبات کیا گیا ہے میراث میں اس کے اُصولی نظائر بھی موجود ہیں۔ فرمان الٰہی ہے من بعد وصیة یوصی بها او دین۔ تو اگر میت نے ایک ہزار درہم چھوڑے جبکہ وہ ایک کا ہزار روپے کا مقروض دوسرے کا بھی ہزار روپے کا مقروض ہو اور تیسرے کا پانچ سو کا مقروض ہو تو ترکہ کے ہزار روپے قرض خواہوں میں ان کے قرضوں کے تناسب سے تقسیم کیے جائیں گے۔ (یعنی ہزار قرض والے کو چار سو روپے اور پانچ سو قرض والے کو دو سو روپے دیں گے) اور یہ کہنا جائز نہیں کہ چونکہ کل قرض ڈھائی ہزار روپے کو ایک ہزار میں سے وصول کرنا ممکن نہیں لہٰذا قرضوں کو ترکہ میں ضرب دینا بھی ممکن نہیں۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے ایک کے لیے اپنے تہائی مال کی وصیّت کی اور دوسرے کے لیے اپنے مال کے چھٹے حصّے کی وصیّت کی اور ورثاء نے تہائی وصیّت سے زائد کی اجازت نہیں دی تو ان کی وصیّتوں کے بقدر تہائی میں دونوں کا تضارب کیا جائے گا پس ان میں سے ایک کے لیے $\frac{1}{6}$ کے ساتھ ضرب دیا جائے گا اور دوسرے کے لیے $\frac{1}{3}$ کے

من الثلث - وكذلك الابن يستحق جميع المال لو انفرد وللبنت النصف لو انفردت فاذا اجتمعا ضرب الابن بجميع المال والبنت بالنصف فيكون المال بينهما اثلاثا وهكذا سبيل العول في الفرائض عند تدافع السهام

ساتھ ضرب دیا جائے گا جبکہ نصف کو (جو کہ تہائی اور چھٹے حصّے کا مجموعہ ہے) تہائی میں سے وصول کرنا محال ہے اسی طرح اگر بیٹا تنہا ہو تو وہ کل مال کا مستحق ہوتا ہے اور بیٹی تنہا ہو تو وہ نصف کی مستحق ہوتی ہے اور مال کی تقسیم دونوں میں تہائیوں میں ہوتی ہے اور حصّے جب متعیّن ہوں اور ان میں ٹکراؤ ہو تو اس کے حل کا طریقہ عول کا ہے۔

واللہ اعلم (ص ۹۱ ج ۲ احکام القرآن)

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مذکورہ آیات کے ترجمے اور اسلوب کو دیکھتے ہوئے ان پر عمل کے لیے عول کے طریقے سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ ان لوگوں کے عالی ذہنوں میں ڈالا جن کو فقہا کہا جاتا ہے اور فقہاء صحابہ میں بھی تھے۔ تابعین میں بھی اور بعد والوں میں بھی۔ جاوید صاحب جب فقہاء کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں طنز و تشنیع صاف محسوس ہوتی ہے، لیکن کوئی سورج پر تھوکے تو اپنے ہی اُوپر آ کر گرتا ہے اور یہ اُسی کا اثر ہے کہ جاوید صاحب سے ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں جو ذرا بھی عقل و علم رکھنے والے سے سرزد نہیں ہوتیں۔

جاوید غامدی صاحب کی چوتھی غلطی اور اس کا جواب

جاوید غامدی صاحب لکھتے ہیں۔

"فان كان له اخوة فلامه السدس کے بعد بھی ہمارے نزدیک ولابیه السدس ایضا یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ اس کا قرینہ واضح ہے۔ بھائی بہن موجود ہوں تو ماں کا حصّہ وہی ہے جو اُوپر اولاد کی موجودگی میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ مذکور اس بات پر خود دلیل ہے کہ باپ کا حصّہ بھی وہی ہونا چاہیے۔ اس کو الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پڑھنے والا صاحب ذوق ہو تو بغیر کسی تکلّف کے سمجھ لے گا کہ جب ماں کا حصّہ اصل کی طرف لوٹ گیا تو باپ کا حصّہ خود بخود لوٹ جائے گا۔

ہمارے فقہاء ماں کو چھٹا حصّہ دینے کے بعد باقی سارا مال باپ کو دلواتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے فان کان لہ اخوۃ کو ورثہ ابواہ سے متعلق مانا ہے حالانکہ کلام کی تالیف کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی۔ فان لم یکن لہ ولد سے جو شرطیہ جملہ شروع ہوا تھا وہ اپنی جزا فلامہ الثلث پر ختم ہوگیا۔ اس کے بعد اگر ورثہ ابواہ پر کسی شرط زائد کا تذکرہ مقصود ہوتا تو اس کے لیے موزوں اسلوب فان کان لھما ولد فلامہ السدس کا تھا۔ فان کان لہ اخوۃ فلامہ السدس شرط و جزا پر مشتمل ایک مستقل جملہ ہے جس میں مرنے والے ہی کے لیے ایک مزید وصف کا تذکرہ شرطیہ اسلوب میں ہُوا ہے لہٰذا اس کا تعلّق اگر ہوسکتا ہے تو فان لم یکن لہ ولد ہی سے ہوسکتا ہے۔ گویا ایک نوع کی عدم موجودگی سے والدین کے حصّے میں جو اضافہ ہُوا تھا ایک دوسری نوع کی موجودگی نے اسے ختم کر دیا۔ ہم اسی بات کو اپنی زبان میں ادا کرنا چاہیں تو کہیں گے۔ اولاد موجود ہو تو والدین کا حصّہ ایک تہائی ہے اور اگر اولاد نہ ہو اور والدین ہی وارث ہوں تو سارا ترکہ ان کا ہے اور اگر بہن بھائی ہوں تو والدین کو ایک تہائی ملے گا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حکم کی جو صورت اولاد کی موجودگی میں تھی۔ بھائی بہن موجود ہوں تو وہی صورت لوٹ آئے گی۔

ان آیات سے واضح ہے کہ اولاد کی غیر موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے بہن بھائیوں کو اُن کا قائم مقام ٹھہرایا ہے...

اخوۃ کا لفظ اس آیت میں ہمارے نزدیک مطلق وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ بتلانا ہے کہ بھائی بہنوں کی موجودگی میں عام اس سے کہ وہ ایک ہوں یا دو یا دو سے زیادہ ہوں۔ والدین کا حصّہ کم ہوجائے گا۔ اس طرح کے اسلوب میں جمع تعداد میں کثرت کو بیان کرنے کے لیے نہیں لائی جاتی۔ لغت عرب میں جس طرح بعض مفرد الفاظ مثنی اور جمع پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح قرینہ دلیل ہو تو جمع کا اطلاق مثنی و مفرد پر بھی ہوتا ہے... ماہرین فقہ و قانون یہاں جمع و مثنی کی بحث کرنے پر مصر ہیں۔ قیاس و اجتہاد میں ان حضرات کے مقام بلند سے مجال انکار نہیں لیکن آیات کا میراث کی تاویل میں قدم قدم پر وہی معاملہ ہے کہ ع بہر زمین کہ رسیدیم آسماں پیدا است ص ۵۵ تا ۵۷ میزان

جاوید غامدی صاحب کی اس طویل عبارت کے آخری جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ مجتہد کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اُصول بلاغت اور اسالیب قرآنی سے واقف ہو۔ اسی لیے کہتے ہیں، "قیاس و اجتہاد میں ان حضرات کے مقام بلند سے مجال انکار نہیں، لیکن آیات میراث کی تاویل میں قدم قدم پر وہی معاملہ ہے کہ ع بہر زمین کہ رسیدیم آسمان پیدا است" حالانکہ خود غامدی صاحب کے استاذ امام امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں۔

"اجتہاد کا اہل وہ شخص ہے جس کو کتاب و سُنّت پر پُورا پُورا عبور حاصل ہو" ص ۴۹

"یہ (یعنی ہمارے چاروں) ائمہ کتاب و سُنّت کے علم میں بھی یکتائے روزگار تھے" ص ۵۰

اب سوچنے کی بات ہے کہ جو شخص کتاب اللہ کے علم میں یکتائے روزگار ہو اور اس کو اس پر پُورا پُورا عبور حاصل ہو کیا وہ ذوق عربیت اور اسالیب کلام سے ناواقف ہو سکتا ہے۔ غامدی صاحب ائمہ مجتہدین پر اعتراض کرتے ہوئے اس بات سے بالکل صرف نظر کر لیتے ہیں کہ خود انکے کلام میں کیسا تضاد پیدا ہو گیا ہے۔

مذکورہ بالا عبارت میں غامدی صاحب نے اپنی جانب سے جو نئی بات نکالی ہے وہ یہ ہے کہ اخوۃ کی موجودگی میں خواہ وہ ایک ہی بھائی یا بہن ہو باپ کا حصّہ ترکہ کا چھٹا حصّہ ہو گا اور باقی اخوۃ میں تقسیم ہو گا۔

جاوید غامدی صاحب کی یہ بات بالکل غلط ہے۔ خود اُنھوں نے میزان ص ۶۵ پر یہ حدیث نقل کی اور اس کو حجّت بنایا۔

عن ابن عبّاس قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم الحقوا الفرائض باھلھا فما ترکت الفرائض فھو لاولی رجل ذکر	حضرت عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا اصحاب فرائض کو اُن کا حصّہ دو پھر اگر کچھ باقی بچے تو وہ قریب ترین مرد کے لیے ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہُوا کہ اصحاب فرائض کے بعد عصبات کی باری آتی ہے اور عصبات کے

لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اصحاب فرائض نہ ہو۔

عن عمران بن حصين قال جاء رجل الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ان ابنى مات فمالى من ميراثه؟ قال لك السدس ۔ فلما ادبر دعاه فقال سدس آخر فلما ادبر دعاه فقال لك السدس الآخر طعمة" (اعلاء السنن ص ۳۶۳ ج ۱۸)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا میرا پوتا مرگیا تو میرے لیے اس کی میراث میں سے کتنا حصّہ ہے۔ آپ نے فرمایا تیرے لیے چھٹا حصّہ ہے۔ جب وہ مڑا تو آپ نے اسکو بلایا اور فرمایا (تیرے لیے) ایک چھٹا حصّہ اور ہے۔ پھر جب وہ مڑا تو آپ نے اسے بلایا اور فرمایا یہ دوسرا چھٹا حصّہ تیرے لیے رزق ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پہلا چھٹا حصّہ تو دادا کو اصحاب فرائض میں سے ہونے کی بناء پر ملا اور دوسرا چھٹا حصّہ دیگر اصحاب فرائض (جو غالباً دو بہنیں یا دو بیٹیاں ہوں گی) کو دینے کے بعد بچنے والا مال تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے دادا کو قریب ترین مرد ہونے کی بناء پر دیا

غرض اصحاب فرائض اگر میّت کے قریب ترین مرد ہوں تو اپنا مقرّرہ حصّہ لینے کے بعد وہ آخر میں بچنے والے مال کو عصبہ بن کر لیتے ہیں۔ اب ان مثالوں پر غور کیجیے۔

۱۔ میّت کے وارثوں میں ایک بہن ہے اور ماں باپ ہیں۔ ماں باپ کو چھٹا چھٹا حصّہ دیں گے اور بہن بھی اصحاب فرائض میں سے ہونے کی بناء پر اپنا نصف حصّہ لے گی۔ اب باقی بچ رہنے والے مال کا مستحق کون ہے؟ اُوپر مذکور حضرت عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہ کی روایت میں مندرج قاعدے کی بناء پر باقی مال باپ کو ملنا چاہیے اور غامدی صاحب بھی اس حدیث کو حجّت مانتے ہیں، لیکن آیت کے اس مقام پہ غامدی صاحب نے ایک نیا آسمان دریافت کیا ہے وہ یہ کہ باپ کو صرف چھٹا حصّہ ملے گا اور ماں باپ سے بچ رہنے والے چھ میں سے چار حصّے بہن کو ملیں گے۔

غامدی صاحب نے یہ کہہ کر کہ "اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حکم کی جو صورت اولاد کی موجودگی

میں تھی - بھائی بہن موجود ہوں تو وہی صُورت لوٹ آئے گی"۔ اخوۃ کو اولاد کی مماثل نوع بتایا۔ لہٰذا اب ہم اس پر غور کریں کہ میّت کے وارثوں میں صرف ماں باپ اور ایک بیٹی ہو تو ماں باپ کو چھٹا چھٹا حصّہ اور بیٹی کو نصف دے کر باقی چھٹا حصّہ کس کو دیا جائے۔ بیٹی چونکہ ایک ہے اس لیے اس کو نصف سے زیادہ نہیں دے سکتے کیونکہ اس کے لیے نصف ہونے کی اس آیت میں تصریح کی گئی ہے یعنی وان کانت واحدۃ فلھا النصف (اور بیٹی اگر ایک ہو تو اس کے لیے نصف حصّہ ہے) اور چونکہ یہ الفاظ فان کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترک کے تحت مندرج ہیں یعنی وان کانت واحدۃ کا عطف ان کن نساء فوق اثنتین پر ہے لہٰذا کلمہ فاء کے تحت داخل ہونے کی وجہ سے دونوں کا ایک ہی حکم ہے اور جب خود غامدی صاحب یہ کہتے ہیں " فان کن نساء فوق اثنتین کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی اولاد میں صرف لڑکیاں ہی ہوں تو خواہ دو ہوں یا دو سے زائد اُن کا حصّہ بہرحال دو تہائی سے زیادہ نہیں ہوگا۔ تو اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ اولاد میں اگر صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حصّہ بھی بہرحال نصف سے زیادہ نہیں ہوگا"۔

جب بخوبی واضح ہوگیا کہ اولاد میں صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حصّہ کسی حال میں بھی نصف سے زائد نہیں ہوگا تو اب اُوپر مذکورہ صُورت میں سوال پیدا ہُوا کہ بقیہ چھٹا حصّہ کس کو دیا جائے ؟ لامحالہ وہ باپ کو ملے گا جو عصبہ بن کر اس کا حق دار ہوگا۔

اور جب غامدی صاحب کے بقول حکم کی جو صُورت اولاد کی موجودگی میں تھی بھائی بہن موجود ہوں تو وہی صورت لوٹ آئے گی تو لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگر ایک بہن ہو تو اس کو نصف حصّہ دے کر باقی چھٹا حصّہ باپ کو ملے جو عصبہ ہونے کی وجہ سے اس کا حق دار ہوگا۔

۲۔ کسی میّت کے وارثوں میں ماں باپ اور ایک بیٹا ہو تو ماں باپ کو چھٹا چھٹا حصّہ دے کر باقی بیٹے کو اس کے عصبہ یعنی قریب ترین مرد ہونے کی وجہ سے دیں گے۔ کیونکہ عصبات میں بیٹا باپ کے مقابلے میں زیادہ قریب ہے۔ اس کے برخلاف اگر وارثوں میں ماں باپ کے ساتھ اگر فقط ایک بھائی ہو تو ماں باپ کو چھٹا چھٹا حصّہ دے کر غامدی صاحب کہتے ہیں کہ باقی بھائی کو دیدو۔ حالانکہ بھائی بھی عصبہ ہے، لیکن بیٹے کے برعکس اس کا مرتبہ میّت کے باپ کے بعد ہے۔ لہٰذا عصبات کے قانون کے تحت باقی کا باپ کو ملنا چاہیے نہ کہ بھائی کو۔ خود غامدی صاحب

نے عصبات کا قانون ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔ "کوئی شخص کسی کو وارث بنائے بغیر دُنیا سے رُخصت ہو جائے تو یہ ترکہ اس کے عصبات میں اور عصبات نہ ہوں تو ذوالارحام میں الاقرب فالاقرب کے اُصول کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔"

جاوید غامدی صاحب تو لبید اعشیٰ اور زہیر و امرؤ القیس کی زبان کے باذوق طالب علم ہیں اور اعلیٰ کلام کے اسالیب بلاغت کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ پھر آخر ان سے کیوں ایسی غلطیاں سرزد ہو رہی ہیں؟ وجہ ظاہر ہے کہ اُنھوں نے قرآن پاک کو بھی فقط ادب کی ایک کتاب سمجھ لیا ہے جس میں گنجائش ہوتی ہے کہ سامع اور قاری اپنے ذوق کا مطلب بھی نکال سکے، لیکن قرآن پاک میں اعلیٰ ادبی معیار کے ساتھ ساتھ جو کلامی و فقہی باریکیاں ہیں اُن کو سمجھنے کے لیے جس فقاہت اور اجتہاد کی ضرورت ہے غامدی صاحب اس کی ضرورت اور اس کی اہمیّت ہی کے منکر ہیں تو وہ اُن کو کیا خاک سمجھیں گے۔

بقیہ: اسلام اور فریضۂ تبلیغ

کی کوششوں سے اب تک صُوبۂ بنگال میں پچاس ہزار مُسلمان مرتد ہو چکے ہیں۔ ہمدم ۲۸ مئی ۱۹۲۷ء)

اسی طرح سے مختلف اشاعتیں ظہور میں آچکی ہیں اور اس قوم کی دن و رات کی سرگرمی بلاشک و شبہ نہایت خطرناک ہے، اس لیے نہایت ضروری ہے کہ مُسلمان اپنے بھُولے ہُوئے سبق کو یاد کریں اور پُوری جدّوجہد کے ساتھ اجتماعی قُوّت سے میدانِ تبلیغ و اصلاح میں اُتر آئیں۔

مَیں نے آپ بزرگوں کی بڑی سمع خراشی کی۔ اب میں آپ حضرات کا تہ دِل سے شُکر ادا کرتا ہُوا آپ سے جُدا ہوتا ہوں اور اُمّیدوار ہوں کہ میری معروضات پر غور و فکر فرمائیں اور عملی کارروائیوں میں پُرزور حصّہ لیں۔ مرض اور مصیبت کو خفیف نہ سمجھیں۔ خُدا آپ کی اور ہماری مدد فرمائے۔

قسط:۵

جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار و نظریات

"قانونِ میراث" کا تنقیدی جائزہ

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد زید مجدہم
مدرّس و نائب مفتی و فاضل جامعہ مدنیہ

جاوید صاحب کی پانچویں غلطی اور اس کا جواب

کلالہ کی بحث کے ذیل میں جاوید صاحب لکھتے ہیں :

"باعتبار مجاز ائمہ لغت نے بالعموم اس کے تین معنی بیان کیے ہیں۔
ایک وہ شخص جس کے پیچھے اولاد اور والد دونوں میں سے کوئی نہ ہو۔
دوسرے وہ قرابت جو اولاد اور والد کی طرف سے نہ ہو۔

تیسرے کسی شخص کے وہ رشتہ دار جن کا تعلق اس کے ساتھ اولاد اور والد کا نہ ہو۔

جہاں تک پہلے معنی کا تعلق ہے۔ فقہاء نے اگرچہ یہاں بالاتفاق وہی مراد لیے ہیں لیکن آیت ہی میں دلیل موجود ہے کہ یہ معنی یہاں مُراد لینا کسی طرح ممکن نہیں ہے غور فرمائیے۔ یوصیکم اللہ فی اولادکم جو سلسلۂ بیان شروع ہوتا ہے اُس میں اولاد اور والدین کا حصّہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تعمیل وصیّت کی تاکید من بعد وصیة یوصین بها او دین اور من بعد وصیة توصون بها او دین کے الفاظ میں کی ہے۔ ازواج کے حصوں میں اسی مقصد کے لیے من بعد وصیة یوصین بها أو دین اور من بعد وصیة توصون بها او دین کے الفاظ آئے ہیں۔ تدبّر کی نگاہ سے دیکھیے تو ان سب مقامات پر فعل مبنی للفاعل (معروف) استعمال ہُوا ہے اور یوصی یوحین اور توصون میں ضمیر کا مرجع ہر جملے میں بالصراحت مذکور ہے، لیکن قرآن کا ایک طالب علم اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتا کہ کلالہ کے احکام میں یہی لفظ

بنی للمفعول (مجہول) ہے۔ یہ تبدیلی صاف بتا رہی ہے کہ ان کان رجل یورث کلالۃ او امرأۃ میں یوصی کا فاعل یعنی موروث مذکور نہیں۔ اس وجہ سے اس آیت میں کلالہ کو کسی طرح مرنے والے کے لیے اسم صفت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تغیرِ حجت قطعی ہے کہ قرآن مجید نے یہ لفظ اس آیت میں پہلے معنی یعنی اس شخص کے لیے جس کے پیچھے اولاد اور والد دونوں میں سے کوئی نہ ہو استعمال نہیں کیا ہے

اب رہے دوسرے اور تیسرے معنی تو ان میں سے جو بھی مُراد لیے جائیں۔ آیت کا مدعا چونکہ ایک ہی رہتا ہے اس لیے ترجیح محض حسنِ تالیف کے لحاظ سے ہوگی، چنانچہ آیت میں یورث باب افعال سے بنی للمفعول ہے۔ . . اس تالیف کلام کی رو سے اس ٹکڑے کا ترجمہ یہ ہوگا "اور کسی مرد یا عورت کو اس حال میں ترکے کا وارث بنایا جاتا ہے کہ وہ کلالہ ہے"

"وارث بنانے کا اختیار مرنے والے ہی کو ہوگا . . ." میزان ص ۶۳-۶۴

جاوید صاحب نے اپنی ان عبارات میں چند اُمور کا دعویٰ کیا ہے۔

① کلالہ کا معنی اوّل اس مقام پر مراد لینا کسی طرح ممکن نہیں ہے اور اس کے لیے معروف سے مجہول کی طرف تغیر حجّت قطعی ہے۔

② یورث باب افعال سے ہے۔

③ وارث بنانے کا اختیار مرنے والے کو ہے۔

ہم ترتیب سے ان پر اپنا تبصرہ تحریر کرتے ہیں۔

جاوید غامدی صاحب کا پہلا دعویٰ

اس مقام میں کلام کا پہلا معنی مُراد لینا کسی طرح ممکن نہیں

ہم کہتے ہیں کہ جاوید غامدی صاحب کو تو حجّت قطعی کا مطلب ہی معلوم نہیں اور اس میں وہ اپنے امام استاذ اصلاحی صاحب کے سچّے شاگرد ہی نہیں بلکہ ان سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ ان دونوں حضرات کے نزدیک حجّت قطعی اور دلالت قطعی میں قطعیت محض اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ اس کے مدعی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لبید و اعشیٰ اور زہیر و امرؤ القیس کی زبان کے ذوق سے دوسرے حضرات سرے سے ناآشنا ہیں اور اعلیٰ کلام کے اسالیب بلاغت کے ذوق سے بھی ان کے علاوہ

دوسرے لوگ محروم ہیں لہٰذا اس میدان میں کوئی اُن کے مقابلے کا نہیں اور کوئی ان کے مقابلے میں اپنی بات رکھنے کا اہل نہیں کہ ان کی بات قطع ہو سکے۔ لہٰذا یہ جس کو حجّت کہیں وہ حجّت قطعی ہوتی ہے اور جس دلالت کو یہ تسلیم کریں وہ دلالت قطعی ہی ہوتی ہے

لیکن غامدی صاحب کی یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ

۱۔ خود غامدی صاحب کے استاذ امام امین احسن اصلاحی صاحب بھی اس مقام پہ کلالہ کا پہلا ہی معنی مراد لیتے ہیں اور اپنی تفسیر تدبّر قرآن میں آیت کا یہ ترجمہ کرتے ہیں۔

"اگر کسی مرد یا عورت کی وراثت اس حال میں تقسیم ہو کہ نہ اس کے اصول میں کوئی ہو نہ فروع میں اور ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ... (تدبر قرآن ص ۳۱ ج ۲)

اور سورہ نساء کی آخری آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"کلالہ سے مراد وہ مورث ہے جس کے نہ اُصول میں کوئی ہو نہ فروع میں صرف بھائی بہن وغیرہ ہوں"۔ (تدبر قران ص ۲۱۱ ج ۲)

۲۔ ابوبکر جصاص رحمہ اللہ احکام القرآن میں ذکر کرتے ہیں۔

(الف) عن الحسن بن محمد قال سألت ابن عبّاس عن الكلالة فقال من لا ولد له ولا والد۔

حسن بن محمد کہتے ہیں میں نے ابن عبّاس رضی اللہ عنہ سے (قران میں مذکور) کلالہ کے بارے میں پُوچھا تو اُنھوں نے فرمایا اس سے مُراد وہ شخص ہے جس کی نہ اولاد ہو اور نہ والد ہو۔ (یعنی جس کے اُصول و فروع نہ ہوں)

(ب) روى طاؤس عن ابن عبّاس قال كنت آخر الناس عهدا بعمر بن الخطاب فسمعته يقول القول ما قلت قلت وما قلتَ قال الكلالة من لا ولد له

طاؤس حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں لوگوں میں سب سے آخر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرنے والا تھا۔ تو میں نے اُن کو وہی بات کہتے سُنا جو میں خود کہتا تھا۔ طاؤس کہتے ہیں میں نے پُوچھا آپ کیا کہتے

تھے۔ فرمایا (میں یہ کہتا تھا کہ) کلالہ سے مُراد وہ شخص جس کی اولاد نہ ہو۔

غامدی صاحب تو فرماتے ہیں کہ اس مقام میں پہلا معنی مراد لینا ممکن ہی نہیں جبکہ یہ حضرات پہلا ہی معنی مراد لے رہے ہیں اور جس کو غامدی صاحب حجّت قطعی سمجھ رہے ہیں ان کا اس کی طرف سرے سے التفات ہی نہیں اور غامدی صاحب کی مذکور حجّت قطعی واقعی ہے ہی ناقابلِ التفات وہ تو اس کا مصداق ہے

؎ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی کا کنبہ جوڑا

غامدی صاحب نے کلالہ کے پہلے معنی کے بارے میں یہ بھی کہا ہے "اس کا استعمال اگرچہ اُصول عربیت کے مطابق ہے، لیکن اس کی کوئی نظیر کلام عرب میں ہمیں نہیں مل سکی"۔

غامدی صاحب کا یہ قول دو اعتبار سے محل نظر ہے:

(الف) یہ اعتراف کرنے کے باوجود کہ پہلے معنی میں کلالہ کا استعمال اُصولِ عربیت کے مطابق ہے۔ یہ کہنا کہ اس مقام میں پہلا معنی مُراد لینا کسی طرح ممکن نہیں غامدی صاحب کا عجیب تضاد ہے۔

(ب) یہ کہنا کہ اس کی کوئی نظیر کلام عرب میں ان کو نہیں مل سکی اس سے بہرحال یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ کلام عرب میں اس کی نظیر ہے بھی نہیں۔ دیکھیے فرزدق شاعر کا یہ شعر ہے۔

ورثتم قناة الملك لا عن كلالة عن ابنی مناف عبدشمس وهاشم

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فرزدق نے اس شعر میں کلالہ کا استعمال مورث کے لیے کیا ہے۔

فان معناه انكم ما ورثتم الملك عن الاعمام بل عن الآباء فسمى العم كلالة وهو ههنا مورث لا وارث

ترجمہ: کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ملک چچاؤں سے میراث میں پایا۔ بلکہ آباء سے پایا ہے۔ فرزدق نے اس شعر میں چچا کو کلالہ کہا جو یہاں مورث ہے وارث نہیں ہے۔

علاوہ ازیں یہ غور کرنے کی بات ہے کہ جب ایک معنی اُصولِ عربیت کے مطابق ہے اور صحابہ سے اس کے موافق قول بھی مل رہا ہے تو محض کلام عرب میں اس کی نظیر نہ ملنا آخر

اس معنی کو لینے سے کیسے مانع بن سکتا ہے؟ اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ منقول کلام عرب میں تمام استعمالات پائے بھی جاتے ہوں۔

پھر غامدی صاحب کس آسانی سے یہ فرماتے ہیں۔

"فقہاء نے اگرچہ یہاں بالاتفاق وہی معنی (یعنی پہلا معنی) مراد لیے ہیں"، لیکن غامدی صاحب کی یہ تحقیق بھی بے بُنیاد ہے۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں۔

ثم ان الذی علیہ اھل الکوفۃ وجماعۃ من الصحابۃ والتابعین ھو ان الکلالۃ ھنا بالمعنی الثالث (یعنی من لیس بوالد ولا ولد من المخلفین)۔ وروی عن آخرین منھم ابن جبیر وصح بہ خبر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھا بالمعنی الثانی (یعنی من لم یخلف والدا ولا ولدا)

پھر اہلِ کوفہ اور صحابہ و تابعین کی ایک جماعت نے کلالہ کا تیسرا معنی اختیار کیا ہے (یعنی اولاد و والد کے علاوہ دیگر وارث) اور بعض دوسروں نے دوسرا معنی اختیار کیا ہے (یعنی وہ میّت جس کے نہ اُصول ہوں نہ فروع ہوں)۔ یہی سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول ہے اور اس کے موافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث بھی وارد ہے۔

جاوید غامدی صاحب کا دوسرا دعوٰی:
یُوْرَثُ باب افعال سے ہے

غامدی صاحب نے اپنے پہلے دعوٰی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہ دوسرا دعوٰی کیا کہ آیت میں یورث باب افعال سے مبنی للمفعول (یعنی مضارع مجہول کا فعل) ہے۔

لیکن یہ غامدی صاحب کا نرا دعوٰی ہی دعوٰی ہے جس کی کوئی دلیل اُنھوں نے نہیں دی۔ علامہ زمخشری جن کو خود غامدی صاحب بھی امام لغت مانتے ہیں اپنی تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں۔

(وان کان رجل) یعنی المیت و (یورث) من ورث ای یورث منہ وھو صفۃ لرجل یعنی یورث وَرِثَ سے بنا ہے جو کہ ثلاثی مجرد ہے۔

یہی بات رُوح المعانی میں بھی لکھی ہے

یورث علی البناء للمفعول من ورث الثلاثی خبر کان یورث ورث ثلاثی مجرد سے بنی للمفعول ہوکر کان کی خبر ہے۔

اور اگرچہ علّامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے یہ لکھا ہے کہ

ویجوز ان یکون الرجل الوارث ویورث من اورث

یعنی جائز ہے کہ رجل وارث ہو اور یورث باب افعال (اورث) سے ہو۔

لیکن اس صورت میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وارث اگر کلالہ نہ ہو اور اس کے والدین یا اس کی اولاد ہو تو کیا اس صورت میں وارث کے حصّے میں کچھ فرق پڑتا ہے جو ان کی عدم موجودگی میں اس کے بھائی کو چھٹا حصہ دے کر اس کے حصّے کو کم کیا جارہا ہے؟ دوسری بات جو قابلِ غور ہے۔ وہ یہ ہے کہ وارث کلالہ اگر میت کا سگا بھائی ہے اور میت کے اور بھی سگے بھائی ہوں تو کیا سب میراث میں برابر کے شریک نہ ہوں گے، البتہ غامدی صاحب نے یہاں جو ایک نیا آسمان دریافت کیا ہے جو ہم نے ان کے تیسرے دعوٰی کی شکل میں ذکر کیا ہے۔

جاوید غامدی صاحب کا تیسرا دعوٰی

وارث بنانے کا اختیار مرنے والے کو ہے

غامدی صاحب یہ بھی لکھتے ہیں

اس تالیف کلام کی رو سے اس ٹکڑے کا ترجمہ یہ ہوگا۔ "اور اگر کسی مرد یا عورت کو اس حال میں ترکے کا وارث بنایا جاتا ہے کہ وہ کلالہ ہے"

وارث بنانے کا اختیار مرنے والے ہی کو ہوگا اور ترکے کا ــــ کا وارث بنایا جاتا ہے ان الفاظ کا مدعا بھی اس سیاق میں ظاہر ہے یہی ہوسکتا ہے کہ وہ ترکہ جو ان وارثوں کا حصّہ دینے کے بعد یا ان کی عدم موجودگی میں جن کے حصّے خود اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں موجود ہو۔

(میزان ص ۶۴۴)

غامدی صاحب کے اس دعوے کی بنیاد یہ ہے کہ انھوں نے یورث کو باب افعال سے لیا اور یہ

فرض کیا ہے کہ کلالہ کو میّت کی جانب سے وارث بنایا گیا ہے یعنی یہ کہ اس کا فاعل میت ہے۔ لیکن یہ بھی غامدی صاحب کی غلطی ہے گویا عمارت بھی فاسد اور بُنیاد بھی فاسد ہے۔ کیونکہ شریعت میں اورث (باب افعال) یا ورّث (باب تفعیل) کا یہ مطلب نہیں کہ میّت ازخود کسی کو وارث مقرّر کرے بلکہ وارث شریعت کے مقرّر کیے ہُوئے ہیں۔ البتّہ چونکہ میّت کی موت وارث کو حصّہ ملنے کا سبب بنتی ہے۔ اس لیے میّت کے حق میں مجازاً کہہ دیا جاتا ہے کہ اس نے وارث بنایا۔ غرض اس سے یہ مراد لینا کہ میّت شرعی طور پر ازخود وارث بناتی ہے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر غلط ہے۔

۱۔ جاوید صاحب نے ایک حدیث نقل کی ہے اور اس کو حجت بھی بنایا ہے۔

قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم	فرمایا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے
الحقوا الفرائض باھلھا فما	اصحاب فرائض کو اُن کا حصّہ دو پھر اگر
ترکت الفرائض فھو لاولی رجل ذکر	کچھ بچے تو وہ قریب ترین مرد کے لیے ہے۔

اس حدیث میں نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اصحاب فرائض کو حصّہ دینے کے بعد باقی مال قریب ترین مرد کے لیے متعیّن فرما دیا۔ جبکہ جاوید صاحب کی تفسیر کے مطابق وہ اس کے لیے متعیّن نہیں بلکہ میّت وہ کسی اور کے نام کر سکتا ہے۔ اس طرح سے جاوید صاحب نے اس غیر معارض حدیث کو قرآن پاک کے معارض بنا دیا ہے۔

جاوید صاحب اگرچہ یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں اِس صُورت کا حکم ہے جبکہ کوئی شخص بچے ہُوئے ترکے میں کسی کو وارث بنائے بغیر دُنیا سے رُخصت ہو جائے۔" لیکن اوّل تو حدیث میں ایسی کوئی قید ذکر نہیں ہے۔ دوسرے جاوید صاحب کی اسی بات سے یہ واضح ہو گیا کہ حدیث میں اہل فرائض سے مراد صرف وہ وارث ہیں جن کے حصّے شریعت نے خود مقرّر کیے ہیں۔ وہ شخص ان میں شامل نہیں ہے جس کو (جاوید صاحب کے بقول) میت نے وارث مقرّر کیا ہو، کیونکہ بچے ہُوئے ترکے سے مراد وہ مال ہے جو اہلِ فرائض کو دینے کے بعد باقی بچے اور باقی بچے ہُوئے کو پانے والا اہلِ فرائض میں سے نہیں ہے خواہ اس کو میّت نے ہی نامزد کیا ہو۔

۲۔ جس کو جاوید صاحب وارث بنانا کہہ رہے ہیں۔ شریعت اور قرآن کی اصطلاح میں اُس کو وصیّت کرنا کہتے ہیں۔

۳۔ جاوید صاحب نے خود اپنی اس تاویل پر ایک اعتراض وارد کیا ہے لیکن اس کے جواب سے کنی کترا گئے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"آیت کلالہ کی یہ تاویل جو ہم نے کی ہے اس کی رو سے چونکہ بہن بھائی چچا ماموں خالہ پھوپھی وغیرہ سب کلالہ ہیں اور مورث ان میں سے جس کو چاہے ترکے کا وارث بنا سکتا ہے اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی چچا ماموں یا خالہ پھوپھی وغیرہ کو اپنے بھائی بہنوں پر ترجیح دے۔ مرنے والے کے اولاد ہو تو احکام کی یہ صورت ہر لحاظ سے مناسب ہے، لیکن مورث بے اولاد اور اس کے بھائی بہن ہوں تو یہ اختیار قابلِ اعتراض ٹھہرتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اولاد کے بعد کلالہ رشتہ داروں میں سے بھائی بہن ہی اقرب ہیں۔ عقل تقاضا کرتی ہے کہ اس صورت میں ترکے کا بڑا حصہ انہیں ملنا چاہیے۔ آیات میراث میں یہ وضاحت موجود ہے کہ بہن بھائی ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا۔ یہ حصہ چونکہ وہی ہے جو انھیں اولاد کی موجودگی میں ملتا ہے اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں بھی کیا مرنے والے کو یہ اختیار ہے کہ وہ چاہے تو بھائی بہنوں کو وارث بناتے اور چاہے تو انہیں محروم کر دے۔"

اور اللہ کی شان دیکھیے کہ ابتدا میں لبید واعشی اور اسالیب بلاغت اور دلالت قطعیہ اور حجت قطعیہ کے الفاظ سے خوب مرعوب کرنے کی کوشش کی، لیکن آخر میں آکر خود اپنے ہی وارد کیے ہوئے اعتراض کے جواب سے ہی عاجز نہ ہوئے بلکہ یہ بھی اقرار کیا کہ آیت کلالہ کی یہ تاویل (ہے) جو ہم نے کی ہے۔ کہاں قطعی حجت و دلالت اور کہاں تاویل۔ اللہ تعالیٰ نے خوب دکھایا کہ جاوید صاحب جیسے لوگ ایسے ہی کارہائے نمایاں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

قسط : ۶ آخری

سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو انوارِ مدینہ ج ۶ ش ۱۲

جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار و نظریات

"قانونِ میراث" کا تنقیدی جائزہ

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد زید مجدہم
مدرّس و نائب مفتی و فاضل جامعہ مدنیہ

جاوید غامدی صاحب نے "رسالت اور تصوّف" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں اُنھوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ صوفیا نہ صرف حریم نبوّت میں نقب لگانے کے مجرم ہیں بلکہ اس کے بعد یہ خُدا کی بادشاہی میں شریک ہونے کے دعویدار ہیں اور اُس کے لیے اُنھوں نے امام غزالی، شاہ ولی اللہ حضرت مجدّد الف ثانی اور شاہ اسمعیل شہید رحمہم اللہ جیسے حضرات کی کتابوں سے حوالے نقل کیے ہیں۔

تصوّف کا میدان اور ان جیسے حضرات کا کلام! غامدی صاحب نے اس میں دخل دے کر اپنی حقیقت خود ہی کھول دی۔ کہاں یہ لوگ کہ جو اسلامی دُنیا کے مسلمہ امام ہیں اور جن سے اللہ تعالیٰ نے احیائے دین کا کام لیا اور کہاں غامدی صاحب جیسے لوگ کہ جو نہ نقلی دلائل سے کما حقہ واقف نہ عقلی دلائل سے ان کو کچھ مس اور نہ اسرار و حقائقِ روحانیت سے جن کو کچھ تعلّق۔ پھر اُن کی جرأت دیکھئے کہ ان اماموں کے منہ کو آتے ہیں اور بڑی ڈھٹائی سے اپنی جہالت کی سیاہی سے ان کے دامن کو داغدار کرنا چاہتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اوندھے مُنہ گراتے ہیں جو اس کے دوستوں سے عداوت رکھتے ہیں۔

غامدی صاحب کا اپنے مضمون پر استدلال

"قرآن مجید کی رو سے نبوّت محمّد عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ختم ہوگئی۔ اس کے معنی بالبداہت یہی ہیں

کہ اب نہ کسی کے لیے وحی والہام اور مشاہدۂ غیب کا کوئی امکان ہے اور نہ اس بنا پر کوئی عصمت وحفاظت اب کسی کو حاصل ہو سکتی ہے۔ ختم نبوّت کے یہ معنی خود نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بالصراحت بیان فرمائے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے۔

لم یبق من النبوۃ الا المبشرات قالوا وما المبشرات ؟ قال الرؤیا الصالحۃ۔

نبوّت میں سے صرف مبشّرات باقی رہ گئے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا: یہ مبشّرات کیا ہیں؟ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: اچھا خواب (ص ۲۷ ماہنامہ اشراق اگست ۹۳ء)

جواب

اس حدیث سے غامدی صاحب نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت کے بعد عصمت، مشاہدۂ غیب اور الہام وغیرہ کے دعوے باطل ہیں اور زیادہ سے زیادہ اچھے خواب دیکھے جا سکتے ہیں۔ اُن کے اسی استدلال پر صوفیاء کی گمراہی کا دارومدار ہے، لیکن غامدی صاحب کا یہ استدلال مندرجہ وجوہ سے باطل ہے۔

۱۔ خود بخاری ہی میں یہ حدیث ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا

لقد کان فیمن کان قبلکم ناس محدثون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن فی امتی احد فانہ عمر

تم سے پہلے جو ہوئے اُن میں سے ایسے لوگ بھی تھے جن سے فرشتے کلام کرتے تھے اگرچہ وہ انبیاء نہ تھے اور اگر میری اُمّت میں بھی کوئی ایسا ہے تو وہ عمر ہیں۔

اس حدیث میں اِنْ (یعنی اگر) کا لفظ شک کے لیے نہیں ہے بلکہ تحقیق و تاکید کے لیے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس اُمّت میں بھی ایسے لوگ ہیں اور ہوں گے اور ان میں سے ایک عمر ہیں یہ اسلوب ایسا ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں اگر اس محلّہ میں کوئی نیک آدمی ہے تو وہ زید ہے کیونکہ اس جملہ سے ہم شک کا اظہار نہیں کر رہے ہوتے بلکہ تحقیق و تاکید کے ساتھ زید کے نیک ہونے کی خبر دیتے ہیں۔

۲۔ یہ اُمور نبوّت کے ساتھ پائے تو جاتے ہیں لیکن نبوّت کا خاصہ نہیں ہیں کہ صرف نبی میں

پائے جائیں غیر نبی میں نہ پائے جاسکیں۔ اسی لیے اُوپر کی حدیث کے مطابق پہلی اُمّتوں میں بھی ایسے لوگ ہوتے رہے جن سے فرشتوں نے کلام کیا اور جن کو مشاہدۂ غیب حاصل ہُوا۔ اگر یہ فضیلت پچھلی اُمّتوں کو حاصل رہی تو اس اُمّت کے افراد کو بھی حاصل ہو جائے جبکہ اس سے ان کو دین محمدی اور شریعت محمدیہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر مزید ثابت قدمی حاصل ہوتی ہے تو قرآن و حدیث کے کس ضابطہ کے تحت اس کو تسلیم کرنا ممنوع ہے۔

۳۔ پھر یہ حضرات یعنی امام غزالی، حضرت مجدّد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، شاہ اسماعیل شہید رحمہم اللہ اور اُن کے علاوہ ہزاروں جلیل القدر افراد جن کو اس اُمّت کی سیادت و امامت حاصل رہی ہے اپنے مشاہدات ذکر کرتے ہیں اور یہ لوگ جھوٹے بھی نہیں تھے اور ہم اُن کے مشاہدات و تجربات کو محض نفسیاتی و دماغی خلل کا نتیجہ بھی کہہ کر نہیں ٹال سکتے۔ غامدی صاحب اگر ان حضرات کے مشاہدات و تجربات کو صحیح نہیں سمجھتے تو ان پر لازم ہے کہ وہ تجربات و دلائل سے اُن کا غلط ہونا ثابت کرتے۔

اصل بات وہی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کی کہ غامدی صاحب نے حدیث کے مضمون کو صحیح سمجھا ہی نہیں۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عام لوگوں کے اعتبار سے جو بات فرمائی تھی غامدی صاحب اس کو اُمّت کے ہر خاص و عام فرد پر منطبق کرنے لگے اور پھر ان کا کمال دیکھیے کہ محض ایک خبر واحد کی بناء پر اُنھوں نے ایک عظیم سرمایہ کو گمراہ قرار دے دیا۔ یہ کیسے تعجّب کی بات ہے

جاوید غامدی صاحب کا امام غزالیؒ پر اعتراض

اہلِ تصوّف کے نزدیک وحی اب بھی آتی ہے۔ فرشتے اب بھی اُترتے عالم غیب کا مشاہدہ اب بھی ہوتا اور اُن کے اکابر اللہ کی ہدایت اب بھی وہیں سے پاتے ہیں جہاں سے جبریل امین اسے پاتے اور جہاں سے یہ کبھی اللہ کے نبیوں نے پائی تھی۔ غزالیؒ کہتے ہیں۔

"من اوّل الطریق تبتدئ المکاشفات والمشاهدات، حتی انهم فی یقظتهم یشاهدون الملائکة وارواح

"اس راہ کے مسافروں کو مکاشفات و مشاہدات کی نعمت ابتدا ہی میں حاصل ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ بیداری کی حالت

الانبیاء ، و یسمعون منھم اصواتًا و یقتبسون منھم فوائد۔ (المنقذ من الضلال، باب طرق الصوفیہ)

میں نبیوں کی ارواح اور فرشتوں کا مشاہدہ کرتے، ان کی آوازیں سُنتے اور اُن سے فائدے حاصل کرتے ہیں۔"
(ص ۲۸ اشراق اگست ۹۳)

جواب

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں کونسی بات ایسی ہے جو دین کے اور قرآن کے خلاف ہو۔ خود غامدی صاحب کے استاذ امام امین احسن اصلاحی صاحب ہاروت اور ماروت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہاں فرشتوں کے تعلیم دینے کے معاملہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے جس سے بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگوں کو انسانی روپ میں تعلیم دیتے تھے۔ اگر یہ بات ہوتی تو اس میں کوئی خاص اشکال نہیں ہے۔ متعدد واقعات کا خود قرآن سے پتہ چلتا ہے جب فرشتے انسانوں کے اندر خود انسانوں کی شکل و صورت میں نمایاں ہوئے ہیں، لیکن امکان اس بات کا بھی ہے کہ عملیات کے دلدادہ لوگ کسی خاص قسم کی ریاضت اور چلّہ کشی کے ذریعہ سے ان سے روحانی قسم کا ربط پیدا کر کے یہ تعلیم حاصل کرتے رہے ہوں۔ اگر مطلب یہ لیا جائے تو قرآن کے الفاظ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے خلاف جاتی ہو۔ (تدبر قرآن ج ۱ ص ۲۴۳)

پھر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے یہ ثابت کرنا کہ وہ اس کے قائل ہیں کہ وحی اب بھی آتی ہے محض الزام تراشی ہے۔ وہ وحی جو انبیاء علیہم السّلام کا خاصہ ہے وہ کلام الٰہی ہوتا ہے جو تبلیغ کے لیے کسی نبی کی طرف نازل کیا جاتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں ایسی کوئی بات بھی تو ذکر نہیں۔ محض کسی فرشتے کو دیکھ لینا یا اس کی کوئی فائدہ مند بات سُن لینا اس پر اصطلاحی وحی کا اطلاق کرنا غامدی صاحب جیسے لوگوں کا ہی خاصہ ہے۔

غامدی صاحب کا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کے حوالہ سے صوفیاء کے لیے عصمت ہونے کا اعتراض

"ان اکابر کا الہام، ان کی عصمت کی وجہ سے قرآنِ مجید ہی کی طرح ہر شائبہ باطل سے پاک اور ہر شُبہہ سے بالا ہوتا ہے۔ صاحبِ "عبقات" اس ہستی کے بارے میں جو ان کے نزدیک مقامات

میں سے پہلے مقام پر فائز ہوئی ہے لکھتے ہیں:

فھو وجیہ معصوم صاحب ذوق حکیم ثم ان مما یقتضی تربیۃ اللہ فی قیامہ بمنصبہ فھذا الالقاء یسمّٰی تفھیمًا و ان مما یقتضی تیقظ روحہ و عصمتہ الا یختلط بعلومہ شیئٌ مغائر لما تلقاہ من الغیب ولذٰلک کانت الحکمۃ کلّھا حقالا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ ولمّا کان التفھیم من اعلی اقسامھا فلا بعد ان یسمّٰی بالوحی الباطن۔

(الاشارۃ الاجمالیۃ الی مراتب کمال النفس، "عبقات")

"چنانچہ یہ ہستی صاحبِ وجاہت معصوم صاحبِ ذوق اور صاحبِ حکمت ہوتی ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کی تربیت کے پیشِ نظر اس پر وہ علوم القا فرماتے ہیں جو اس کے منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں اس کیلیے نافع ہوتے ہیں۔ اس القا کو تفہیم بھی کہتے ہیں پھر اس کی عصمت اور اس کی رُوح کی بیداری کا ایک تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ غیب سے پایا ہے اس میں اس کے سوا کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ ہو یہی وجہ ہے کہ اسکی حکمت تمام تر حق ہی ہوتی ہے جس میں باطل نہ آگے سے کوئی راہ پا سکتا ہے نہ پیچھے سے اور یہ تفہیم چونکہ اس حکمت کی سب سے اعلیٰ قسم ہے، اس وجہ سے اسے اگر 'وحیِ باطن' سے تعبیر کیا جائے تو یہ کوئی بعید تعبیر نہ ہوگی۔"

جواب

اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے ہم شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کے کیے جانے والے اعتراض کا جو جواب دیا ہے اسے نقل کرتے ہیں۔ غامدی صاحب نے اعتراض ان کی کتاب عبقات کے ایک اقتباس کو لے کر کیا ہے حالانکہ شاہ صاحب نے اسی کتاب میں یہ اعتراض اور تفصیلی جواب بھی تحریر فرمایا ہے۔ غامدی صاحب نے محض اپنے مطلب کی بات لے کر امانت اور دیانت کا جنازہ نکال دیا۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

قد اصر قوم علی ان العصمة لا تثبت لغیر الانبیاء فان کان مرادهم انه لم یثبت من الشرع عصمة غیرهم فمع ما فیه من لزوم تاویل امثال قوله صلّی اللّٰه علیه وسلّم الحق ینطق علی لسان عمر و دار الحق مع علی حیث دار فلیس لنا ان نجادل معهم فی هذا المقام اذ لسنا بصدد ان نثبت هذه المقامات بالنصوص الشرعیة و ان کان مرادهم انها لا تثبت فی نفس الامر فلا بد له من دلیل اذا قضی ما یدعی فیه ان الشرع ساکت عن عصمة غیر الانبیاء والسکوت عن الشئ لا نفیه

والتفصیل ان العصمة عصمتان عصمة مطلقة وهی ما تکون فی جمیع الافعال والاقوال والعلوم وعصمة مقیدة وهی ما تکون فی افعال واقوال و علوم خاصة ای المتعلقة بمنصب أرید قیام هذا الشخص به وایضا لها تقسیم آخر و هی انها ظاهرة ان ثبتت بالشرع ضرورة و خفیة ان لم تکن کذلك و لها تقسیم آخر وهی انها دائمة ان کانت ثابتة للشخص من اوّل الولادة الی موته و حادثة ان ثبتت بعد ظهور آثار الروح الملکوتی ولو ادنی ظهور کالدخول فی الاسلام أو الاخذ فی المجاهدة أو الفوز بألولایة الصغریٰ أو غیر ذلك فالعصمة المطلقة الظاهرة الدائمة للانبیاء وغیرها لغیرهم۔ (عبقات)

ترجمہ: بعض لوگوں کو اس مسئلہ پر شدّت سے اصرار ہے کہ پیغمبروں کے سوا "عصمت" کی صفت کا انتساب کسی دوسرے کی طرف جائز نہیں ہے مگر سوال یہ ہے کہ ان کا اس سے کیا مطلب ہے؟ اگر یہ غرض ہے کہ پیغمبروں کے سوا کسی دوسرے کے لیے عصمت کی صفت شریعت سے ثابت نہیں ہے تو علاوہ اس اعتراض کے یعنی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عمرؓ کے متعلّق فرمایا ہے کہ الحق ینطق علی لسان عمر حق عمر کی زبان پر بولتا ہے۔

یا حضرت علی مرتضیٰ کے متعلّق حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ

دار الحق مع علی حیث دار علی کے ساتھ حق گھوم گیا جدھر بھی علی گھومے

پیغمبر کے ان اقوال کی یا ان ہی جیسے دوسرے اقوال جن کا مفاد بھی یہی ہے ان سب کی خواہ مخواہ

"تاویل کرنی پڑے گی اور اصل تو یہ ہے کہ اس حیثیت سے میں گفتگو ہی نہیں کر رہا ہوں کیونکہ (پہلے ہی بتا چکا ہوں) کہ ان مسائل اور ان مقامات کے متعلق میں شرعی نصوص کے پیش کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوں۔

اور اگر ان کی غرض یہ ہے کہ واقعہ میں پیغمبروں کے سوا عصمت کی صفت کسی دوسرے انسان کے لیے ثابت نہیں ہوسکتی تو ظاہر ہے کہ اس دعوٰی کے اثبات میں دلیل پیش کرنا اُن کا فرض ہے، کیونکہ شرعی طور پر زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوسکتا ہے کہ شریعت پیغمبروں کے سوا دوسروں کی عصمت کے متعلق خاموش ہے، لیکن کسی چیز سے خاموشی کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ شریعت اس کی منکر ہے۔

درحقیقت مسئلہ تفصیل طلب ہے، یعنی عصمت کی دو قسمیں ہیں، ایک عصمتِ مطلقہ جس کا مطلب یہ ہے کہ (زندگی کے سارے شعبوں) اقوال و اعمال و افعال و علوم میں عصمت کو ثابت کیا جائے اور دوسری قسم اسی کی عصمتِ مقیدہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خاص خاص قسم کے افعال و اعمال و اقوال و علوم میں عصمت کو ثابت کیا جائے۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ جس منصب کے فرائض اس شخص کے سپرد ہوئے ہیں اس منصب سے جن اُمور کا تعلق ہے ان میں وہ معصوم ہوتا ہے یعنی غلطی ان خاص اُمور میں اس سے صادر نہیں ہوسکتی۔

عصمت ہی کی تقسیم کی ایک شکل یہ بھی ہے یعنی ایسی عصمت جس کا ثبوت بداتاً شریعت میں مل رہا ہو اس کو عصمتِ ظاہرہ کہہ سکتے ہیں اور جس کا ثبوت مذکورہ بالا نوعیت کے ساتھ مہیّا نہ ہو اس کا عصمتِ خفیہ نام رکھا جاسکتا ہے۔ تقسیم کی ایک صورت یہ بھی ہے، یعنی جس شخص کے لیے عصمت کی صفت ثابت کی وہ پیدائش سے موت تک معصوم ہو اس کا نام عصمتِ دائمہ یا دوامی عصمت ہے، اسی کے مقابلہ میں عصمت ہی کی ایک قسم یہ بھی ہوسکتی ہے کہ زندگی کے کسی خاص انقلاب کے بعد عصمت کی صفت اس کے لیے ثابت ہو مثلاً رُوحِ ملکوتی کے آثار کا ظہور جب ہونے لگے، خواہ کسی درجہ کا ظہور ہو تو اس کے بعد (اس شخص میں جس میں رُوحِ ملکوتی کا ظہور ہُوا ہو عصمت کی صفت پائی جانے لگے اس کا نام "عصمتِ حادثہ" رکھا جا سکتا ہے۔

باقی مَیں نے جو یہ کہا کہ رُوح ملکوتی کا ظہور کسی درجہ میں بھی ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً اسلام میں داخل ہونے کے بعد یا مجاہدہ کے آغاز کے بعد یا ولایتِ صغریٰ سے سرفرازی کے بعد یا اسی قسم کی کسی کیفیّت کے بعد آدمی کا ایسا حال ہوجائے جس کے بعد غلطی اور گناہ کا اس سے صدور نہ ہو۔

(بہرحال ان تقسیموں کے بعد فیصلہ کی صُورت یہ ہوسکتی ہے) کہ عصمت جو مطلقہ ظاہرہ دائمہ ہو یہ تو صرف پیغمبروں ہی کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے سوا عصمت کی دوسری قسمیں پیغمبروں کے سوا دوسرے انسانوں میں بھی پائی جاسکتی ہیں۔

غامدی صاحب کا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کے حوالے سے صوفیہ پر ایک اور اعتراض

اُن کے نزدیک، یہ ہستی اگر نبی کی مقلد بھی بظاہر نظر آتی ہے تو صرف اس وجہ سے کہ اُسے غیب سے اس کی تائید کا حکم دیا جاتا ہے، ورنہ واقعہ یہی ہے کہ وہ ہدایتِ الٰہی اور علومِ غیب کو پانے کے لیے کسی نبی یا فرشتے کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ فرماتے ہیں۔

فالحکیم لوجاهته وعصمته وکونه باسطاً لحظیرة القدس شانه شان الملاء الاعلی یتلقی العلوم من حیث یتلقون لا یقلد احداً فی علومه اللّٰهم الا ان یسمّٰی موافقته لصاحب الشرع تقلیداً لکونه مامورا من الغیب بموافقته و تائیده۔ (عبقات)

"پس اس ہستی کا معاملہ اس کی وجاہت وعصمت کی بنا پر اور اس بنا پر کہ عالمِ قدس کی تجلّیات اس سے پھیلتی ہیں بالکل وہی ہوتا ہے جو آسمان کے فرشتوں کا ہے یہ اپنے علوم وہیں سے حاصل کرتی ہے جہاں سے وہ حاصل کرتے ہیں اور اس معاملے میں کسی کی مقلد نہیں ہوتی۔ ہاں البتہ صاحب شریعت نبی کی تائید و موافقت کے لیے چونکہ یہ غیب سے مامور ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کوئی شخص اگر اس تائید و موافقت کو اس نبی کی تقلید کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے۔"

(ص ۳۰ اشراق اگست ۹۳ء)

جواب

زمانۂ جاہلیت میں بھی ایسے لوگ گزرے کہ جو توحید خالص کے قائل تھے اور شرک اور اعمال بد سے مجتنب تھے ان میں سے بعض اس کا اظہار بھی کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ اے رب ہمیں یہ معلوم نہیں کہ آپ کی عبادت کس طرح کریں؟ سعید بن نوفل بھی ایسے ہی شخص تھے۔ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ بھی ایسے ہی تھے کہ شرک اور تمام بدعملیوں سے دُور تھے اور خالص موحد تھے کیا یہ لوگ ہدایت یافتہ نہ تھے۔ نفس ہدایت اور بعض علوم غیب اُن کو بھی حاصل تھے۔ ہاں دین کی جزوی تفصیلات اور شریعت و قانون کی تفاصیل تو ان کے لیے بھی نبی کی ضرورت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ باتیں اپنے نبی ہی کے ذریعے بتاتے ہیں اس لیے وہ لوگ جو نفس ہدایت پائے ہوئے تھے ان کو حکم ہوتا ہے کہ وہ نبی کی اتّباع اور تاکید کریں۔ نفس ہدایت یعنی توحید خالص اور معرفت الٰہیہ میں وہ نبی کے محتاج نہیں ہوتے، البتہ جب نبی آتے ہیں تو ان کو حکم ہوتا ہے کہ وہ نبی کی تائید کریں جس کی ایک شق یہ بھی ہے کہ وہ نبی کی ہر بات کی تصدیق و تائید کریں خواہ نفس ہدایت سے متعلق ہو اور اپنی معرفت اور ہدایت کو نبی کے کہنے کے تابع رکھیں۔ شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب عبقات میں اُصولی باتوں سے متعلّق بحث کر رہے ہیں۔ شریعت و قانون کی جزوی تفصیلات کے متعلّق بات نہیں کر رہے۔ غامدی صاحب اپنی ناقص علمیت کے باعث اللہ تعالیٰ کے دوستوں پر کیسے کیسے الزام لگا رہے ہیں۔ حالانکہ خود شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ تصریح فرماتے ہیں کہ ایسی ہستی کے علم کا مرتبہ اس علم کے بعد ہے جو وحی کی راہ سے عطا کیا جاتا ہے۔

وذلك لعصمته وكونه مفهما فعلمه يتلو الوحي

جس کا راز ہی ان کی عصمت اور مفہم ہونے کی نعمت ہے جس سے وہ سرفراز ہوتے ہیں گویا ان کے علم کا مرتبہ اس علم کے بعد ہی ہے جو وحی کی راہ سے عطا کیا جاتا ہے۔

غامدی صاحب کا شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کے حوالے سے صوفیہ پر ایک اور اعتراض

"یہ ہستی جب زمین پر موجود ہوتی ہے تو حق وہی قرار پاتا ہے جو اس کی زبان سے نکلتا اور اس کے وجود سے صادر ہوتا ہے۔ قرآن و حدیث کی حجّت بھی اس کے سامنے، اس کی اپنی حجّت کے تابع

ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

و ان الحق یدور معه	اور حق جہاں یہ ہستی گھومتی ہے، اس کے
حیث دار و ذلك لعصمته	ساتھ ہی گھومتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہی
والتحاقه بالملاء الاعلی	ہے کہ یہ ہستی ملاء اعلیٰ کے ساتھ شامل
فلیس الحق الا ما سطع	اور معصوم ہوتی ہے، چنانچہ حق وہی قرار
من صدره فالحق تابع	پاتا ہے جو اس کے سینے سے نمایاں ہوتا ہے
له لا متبوع۔ (عبقہ ۱۱)	پس حق اس ہستی کے تابع ہوتا ہے، وہ حق
	کے تابع نہیں ہوتی

جواب

اول تو غامدی صاحب نے شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت سے جو مطلب نکالا ہے وہ ان کی عبارت سے بہت مختلف ہے عبارت کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔ حق نام ہی اس چیز کا ہے جو اس کے سینے میں چمک اُٹھے" جبکہ غامدی صاحب نے یہ نکالا ہے جو اس کی زبان سے نکلتا ہے اور اس کے وجود سے صادر ہوتا ہے۔ نیز عبارت میں یہ ہے۔" حق اس ہستی کا تابع ہوتا ہے وہ حق کے تابع نہیں ہوتی جبکہ غامدی صاحب نے مطلب یہ نکالا ہے۔ قرآن و حدیث کی حجت بھی اس کے سامنے اس کی اپنی حجت کے تابع ہوتی ہے۔

شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ جو بتانا چاہتے ہیں اس کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ حدیث پڑھیے۔

عن انس و ابن عمر ان عمر قال وافقت ربی فی ثلاث قلت یارسول اللہ لو اتخذنا من مقام ابراهیم مصلی فنزلت

وقلت یارسول اللہ یدخل علی نساءك البر والفاجر فلو امرتهن ان یحتجبن فنزلت آیة الحجاب واجتمع نساء النبی صلی اللہ علیه وسلم فی الغیرة فقلت عسی ربه ان طلقکن ان یبدله ازواجا خیرا منکن فنزلت کذلك (بخاری و مسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کے سینے میں جو حق کا نور چمکا تھا قرآن کے احکام بھی اسی کے موافق نازل ہوئے۔ چونکہ وہ حق حضرت عمرؓ کے سینے اور دل میں پہلے ظاہر ہوا اور پھر اس کے موافق ایک آیت نازل ہوئی تو اسکو شاہ شہیدؒ نے اس سے تعبیر کیا حق اسکا تابع ہوتا ہے تو کیا غلط کیا؟ غامدی صاحب جو تحریف کر جاتے ہیں اس کا انجام وہ خود سوچ لیں۔